اللہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت (یعنی معرفت حاصل) کریں

لا الہ الا اللہ
محمد رسول اللہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر 6

اکابر بالخصوص مجددین رحمۃ اللہ علیہم کی تعلیمات کے تعارف کیلئے

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

مسترشد حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ

و خلیفہ مجاز دیگر اکابر رحمۃ اللہ علیہم

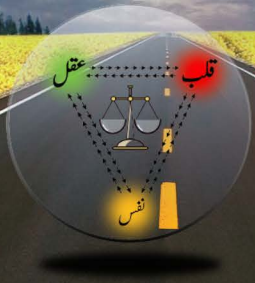

ناشر : خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ راولپنڈی

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور
حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے علوم شریعت، طریقت اور حقیقت (معرفت) سے
کتابچوں کا سلسلہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر 6

(شوال۔ 1443ھ) بمطابق (الرضوان۔1400 شمسی ہجری)
بمطابق (مئی۔ 2022ء)

زیر سرپرستی
حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب مدظلہ العالی

مقصد: اسلاف کی تحقیقات سے اُمت کو آجکل کی سمجھ
میں آنے والی زبان میں روشناس کرنا

مجلس تحقیقات
زین العابدین صاحب مدظلہ

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ
مکان نمبر CB-1991/1 ۔ بلمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ گلی
نمبر 4 ۔ نزد آشیانہ چوک۔ اللہ آباد ۔ ویسٹرج 3 ۔ راولپنڈی

فہرست مضامین

عنوانات		1
1	دیباچہ	2
2	حمد باری تعالیٰ	3
3	نعت رسول اکرم ﷺ	4
4	کلام	6
5	درس قرآن	8
6	مطالعہ سیرت بصورت سوال	12
7	تعلیمات مجددیہ رحمۃ اللہ علیہ	18
8	مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ	49

دیباچہ

الحمد للہ شاہراہِ معرفت کا چھٹا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب کرے اور قبول فرمائے اور ان تمام احباب کے لئے جو اس سے محبت رکھتے ہیں مفید بنائے۔ اس شمارے میں حسبِ معمول "حمد و نعت" کے ساتھ ایک "عارفانہ کلام" پیش کرنے کے بعد حضرت مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب 266 حاضر خدمت ہے جو حضرت نے اپنے صاحب زادگان کو ارسال فرمایا تھا، اس کے بعد حضرت حلیم گل بابا رحمۃ اللہ علیہ کی "مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ" کے ایک حصے کی تشریح پیش کی جارہی ہے۔

اس رسالے میں دو نئے سلسلے شروع کیے جارہے ہیں۔

(1)۔ "آج کی بات" کی جگہ "درسِ قرآن" کا مبارک سلسلہ (جس کی تعلیم روزانہ نمازِ فجر کے بعد خانقاہ میں ہوتی ہے)۔

(2)۔ "سوال و جواب" کی جگہ "مطالعہ سیرت بصورت سوال" کا سلسلہ۔

عقائد کی اہمیت کے پیش نظر ہم حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان مکتوبات کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جن میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے منفرد طرز سے عقائد بیان کئے ہیں۔ چونکہ جلد اول کے مکتوب نمبر 17 اور 67 میں عوام کے لیے نسبتاً آسان انداز میں عقائد بیان کئے گئے ہیں اس لیے ان دونوں مکتوبات کو اس دفعہ علیحدہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس شمارے میں نویں عقیدے کا بیان شامل کیا گیا ہے۔ اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اصل میں اللہ تعالیٰ ہی موجود ہیں۔ اللہ کے علاوہ باقی سب عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ اللہ کے سوا سب کی حقیقت عدم ہے۔ حقیقت اس کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز وجود میں آتی ہے، اللہ کے علاوہ تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ عدم سے وجود میں آئی ہیں اور عدم کی بنیاد شر اور فطرتاً نقص والا ہونا ہے، جب تک کہ اس کو دور نہ کیا جائے۔

شمارہ ہٰذا میں مقاماتِ قطبیہ کے سلسلے میں درس نمبر 4 پیش کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے، جس میں روح اور نفس کے بارے میں تفصیلی ذکر ہے۔ روح کا مقصود اللہ ہے اور نفس کا مقصود خواہشات کو پورا کرنا ہے لہٰذا جو نفس کے پیچھے چلا جارہا ہے وہ روح کو مصیبت میں گرفتار کر رہا ہے۔

مفید مشوروں کی درخواست کے ساتھ قارئین اور رسالے کے درمیان سے نکلتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان مضامین کی تمام برکات ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

سید شبیر احمد کاکا خیل

حمدِ باری تعالیٰ

تجھ پر ہو میری جان فدا　　زندہ رکھے تیری عطا
دل عشق میں مبتلا ترے　　دل چاہے بس تیری رضا
میں تجھ پہ ہمیشہ مر مٹوں　　میں تیری مرضی پر چلوں
تو میرا بنے میں تیرا بنوں　　دل سے ہے یہ میری دعا
جو چاہے تو وہ کر گزروں　　تیرا رہوں جدھر گزروں
تیرے بنا میں کیا کروں　　پسند ہے تیری ہر ادا
تو کتنا مہربان ہے　　کتنا ترا احسان ہے
قربان اگر جان بھی کروں　　حق تیرا ہووے کب ادا
تو ہی بڑا تو ہی عظیم　　ہم پر ہے تو کتنا کریم
تو چاہے ہم قریب ہوں　　تیرے یہ ہے میری صدا
یا رب مجھے قبول کر　　دور مجھ سے سب فضول کر
میں چاہوں خوب کروں مگر　　کیسے کروں تیری ثنا

پیارا جو ہے تجھ کو بہت　　یاد آئے وہ مجھ کو بہت
اس کے طرق پہ چل آؤں　　پائی یہ تیری مدعا
میں نفس کی نہ مانوں کبھی　　دھوکے میں نہ آؤں کبھی
شیطان کے بچ جاؤں اس سے　　بس تیرا بنوں اے میرے الہ
دنیا کی محبت چھوڑ دوں میں　　دل اپنا ایسا موڑ دوں میں
تو ہی دل میں میرے رہے　　میں تجھ کو ہی چاہوں سدا
بندہ ترا شبیرؔ ہے　　حقا بہت حقیر ہے
ہو جائے وہ قبول مگر　　ہے اس کے دل کی یہ دعا

نعت شریف

کلامِ خسرو رحمۃ اللہ علیہ

ابو الحسن یمین الدین امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا نامِ نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان جیسی نابغہِ روز گار، کثیر الجہتی، ہمہ گیر اور متنوع شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی ایک مشہور و معروف نعتیہ غزل پیشِ خدمت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ غزل امیر خسرو کے پانچوں دواوین میں نہیں ملتی لیکن یہ بات سب تذکرہ نگاروں میں متفق ہے کہ یہ غزل امیر خسرو کی ہی ہے اور اسکے پس منظر میں عالمِ روحانیت کا ایمان افروز واقعہ بھی مروی ہے۔

درج ذیل منظوم ترجمہ اس عاجز کا ہے۔ اس میں بحر اور زورِ غزل دونوں کو اصل کے مطابق قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے اصل غزل لکھی جائے گی اور پھر اس کا منظوم ترجمہ۔ یہ جامِ عشق نوش فرمائیے۔

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم
بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود، شب جائے کہ من بودم

پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود، شب جائے کہ من بودم

رقیباں گوش بر آواز، او در ناز، من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود، شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرؔو
محمد شمعِ محفل بود، شب جائے کہ من بودم

منظوم ترجمہ سید شبیر احمد کاکا خیل صاحب مدظلہ

نہ جانے کیا تھی وہ منزل، گزشتہ شب جہاں تھے ہم
تھے گویا رقص میں سب بسمل، گزشتہ شب جہاں تھے ہم

پری پیکر صنم کا سرو قد اور لالہ گوں رخسار
اڑا جاتا تھا جس سے دل، گزشتہ شب جہاں تھے ہم

رقیبوں کا تجسس، وہ سراپا ناز، میں خائف
تھا بات کرنا بہت مشکل، گزشتہ شب جہاں تھے ہم

خدا خود میر مجلس لا مکاں میں تھے ارے خسروؐ
محمد تھے شمعِ محفل، گزشتہ شب جہاں تھے ہم

ہمیں تفسیر مستی کی ملی اور کھل گئیں آنکھیں
غزل یہ وجد کی شبیرؔ نے کی ترجمہ جس دم

کلام

اقبال کا کلام

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بہ دم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم!

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ، ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

اس سے متعلق اپنی رائے

اپنے دل سے پوچھنا ممکن ہو جب دل، دل بنے
دل نہیں ہو وہ کہ جس میں صرف ہو حبِّ شکم

دل بنانا پہلے ہے کہ نفس پہ قابو رہے
ورنہ سالک جانے کیا جو نفس کے ہیں پیچ و خم

واسطے اس کے کہیں دامن پکڑنا شیخ کا
ہو وسیلے سے اگر اللہ کا تجھ پہ کرم

قلب روح بن جائے تیرا اور عقل بھی سِر ترا
تو سمجھ جائے پھر اس کے بعد کہ کیا ہے حرم

تیری منزل آگے بڑھتی جائے گی سن لے شبیرؔ
راہ منزل تیری ہو اور منزل آگے دم بہ دم

درس قرآن

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۞ اَلصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ ۞ اَمَّا بَعْدُ
فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۞
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ
مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾
وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ
كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ
اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۚ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾
فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ لَقَدْ
ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ (الروم)

ترجمہ: "اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کمزوری سے کی، پھر کمزوری کے بعد طاقت عطا فرمائی، پھر طاقت کے بعد (دوبارہ) کمزوری اور بڑھاپا طاری کر دیا، وہ جو چیز چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہی ہے جس کا علم بھی کامل، قدرت بھی کامل ہے"۔ یعنی پہلے پیدا فرمایا پیدائش کے بعد بچہ بالکل کمزور ہوتا ہے کچھ نہیں کر سکتا ہر چیز کے لیے اس کو دوسرے پہ dependent ہونا پڑتا ہے اور پھر اس کے بعد اللہ پاک اس کو جوانی نصیب فرما دیتے ہیں پھر جوانی کے بعد پھر کمزوری اور بڑھاپا آجاتا ہے اور وہی بچپنے کی حالت آ جاتی ہے یعنی بچپن میں جیسے دوسروں پہ dependent ہوتا ہے اسی طریقے سے بڑھاپے میں بھی دوسروں پہ dependent ہو جاتا ہے۔

"وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہی ہے جس کا علم بھی کامل ہے قدرت بھی کامل ہے ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ ہستی ہے، لہذا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جو پیدا کرنا چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے اس کا علم بھی کامل ہے قدرت بھی کامل ہے۔ علم سے مراد یہ ہے کہ اس کو ہر چیز کا پتہ ہے اور قدرت بھی ہے کہ جو کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے

ترجمہ: "اور جس دن قیامت برپا ہو گی اس دن مجرم لوگ قسم کھائیں گے کہ وہ

برزخ میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے اسی طرح دنیا میں بھی وہ اوندھے چلا کرتے تھے" (یعنی بے پروا تھے)۔

ترجمہ: "جن لوگوں کو علم اور ایمان عطا کیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ تم اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق حشر کے دن تک برزخ میں پڑے رہو اب یہ وہی حشر کا دن ہے لیکن تم لوگ یقین نہیں کرتے تھے"۔ واقعتاً یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں ہماری سائنس میں بھی اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں، مثال کے طور پر curve fitting ہے۔ کوئی data ہوتا ہے scattered اس میں ہم curve fit کرتے ہیں اس data کی tendency کو available جو points ہوتے ہیں اس میں سے find کر کے وہ curve draw کرتے ہیں اور پھر بعد میں اسی trend کو آگے بڑھا کر جو بعد میں چیزیں ہو سکتی ہیں اس سے ہم اندازے لگاتے ہیں کہ ایسا ہونا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں جیسے یہ وباء آئی ہے تو لوگوں نے اندازے لگائے کہ اتنی دیر میں یہ ہو جائے گا، اتنی دیر میں یہ ہو جائے گا، اندازے لگائے ہیں اس کو statistics کہتے ہیں یہ باقاعدہ ایک فن ہے۔

اسی طریقے سے اللہ جل شانہ یہ مثالیں دے رہے ہیں پہلے کیا ہوا ہے یہ اللہ پاک نے ہمیں اپنا ڈیٹا خود دے دیا کہ تمہارے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ تو جس ہستی نے پہلے ایسا کیا ہے وہ ہستی بعد میں بھی وہی کر سکتی ہے جو وہ چاہ رہی ہے کیونکہ علم بھی اس کا کامل ہے اور قدرت بھی کامل ہے اب تک جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ کر دیا۔ قرآن پاک میں بار بار آیا کہ پہلے تم کچھ بھی نہیں تھے اللہ پاک نے تمہیں بنا دیا اب جب تم کچھ ہو تو کیا تمہیں دوبارہ نہیں زندہ کر سکتا؟ کیونکہ کافروں کا بڑا اعتراض یہی تھا کہ "ہمیں کیا دوبارہ زندہ کیا جائے گا جب ہم ختم ہو چکے ہوں گے"۔

پھر اللہ تعالیٰ ان کو ان کی عقل کے مطابق بات بتا رہا ہے کہ پہلے جس طرح کیا ہے، اس طرح بعد میں بھی کر سکتا ہوں اور عقلی لحاظ سے بعد میں کرنا تو اس سے زیادہ آسان ہے ہاں البتہ اللہ کے لیے پہلے کرنا بعد میں کرنا برابر ہے اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے وہ تو اس کی حکمت ہے کہ پہلے کیا کیا اور بعد میں کیا کرے گا، لیکن تمہاری عقلوں کے مطابق جو پہلے والی چیز ہے وہ نسبتاً زیادہ مشکل ہے اور جو بعد میں آنے والی چیز ہے اس سے آسان ہے تم آسان سے انکار کرتے ہو جو پہلے والا ہے اس کو مانتے ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ پاک نے ان کو بتایا۔ پھر فرماتے ہیں چنانچہ

ترجمہ: "جن لوگوں نے ظلم کی راہ اپنائی تھی اس دن ان کی معذرت انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی" اصل میں معذرت تب قبول کی جا سکتی ہے جب بعد میں بھی عمل

کرنے کا کوئی موقع ہو۔ ایک آدمی کہتا ہے میں آئندہ نہیں کروں گا تو آئندہ کر سکے گا تو نہیں کرے گا، پھر اس کی بات کی value ہو گی۔ جیسے انسان paper کر رہا ہے اگر اس کو اس دوران پتا چل گیا کہ میں نے غلط کیا اس کو کاٹ کر صحیح لکھ دے یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر paper کا time ختم ہو گیا اور ایک منٹ کے بعد وہ آئے اور کہے جی مجھے یاد آگیا مجھے اس طرح کرنا چاہیے تھا تو کیا اس کو paper واپس دیا جائے گا؟ اگر اس کو paper دوبارہ واپس دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا پھر تو ہر ایک کہے گا مجھے بھی واپس دیا جائے۔ انصاف تو یہ ہو گا کہ ہر ایک کو موقع دیا جائے یہ بات ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا وہ سختی کے ساتھ روک دیا جائے گا۔ ہمارے بعض teachers تو جب paper کا ٹائم ختم ہو جاتا، کہتے paper ختم، قلم رکھ دو اس کے بعد اگر کچھ لکھا تو اس کا paper ضبط کیا جائے گا۔ جو کچھ تم لوگوں نے لکھا بس ہو گیا اس کے مطابق اب فیصلہ ہو گا معذرت والی بات ختم ہو گئی کیونکہ معذرت کا تعلق future کے ساتھ possibilty پہ ہے کہ بعد میں وہ کام کر سکتا ہے یا نہیں، اگر کر سکتا ہو اور معذرت کرے تو اس کی معذرت قبول کی جا سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ تو قبول فرماتے ہیں کیونکہ جب کوئی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول فرماتے ہیں لیکن اس کا تعلق موت سے پہلے پہلے ہے، موت کے بعد یہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے اور نہ ان سے یہ کہا جائے گا کہ اللہ کی ناراضگی دور کر لو۔

ترجمہ: "اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن میں (لوگوں کو سمجھانے) کی خاطر ہر قسم کی باتیں بیان کی ہیں اور جیسے ہمارے سامنے آ رہی ہے یہ بھی قرآن ہے اور (اے پیغمبر)! ان کا حال یہ ہے کہ تم ان کے پاس کوئی بھی نشانی لے آؤ یہ کافر لوگ پھر بھی یہی کہیں گے کہ تم کچھ بھی نہیں بلکہ غلط کار ہو" اصل میں جس نے نہ ماننے کا فیصلہ کیا ہو آپ اس کو جتنے بھی دلائل دیں، وہ دلائل سے نہیں مانے گا کیونکہ یہ اس کے نفس کی خواہش کے خلاف ہے لہٰذا وہ اپنے نفس کی مانے گا تمہاری نہیں مانے گا۔ لیکن جو طلب گار ہو گا جو چاہتا ہو کہ مجھے صحیح راستہ مل جائے تو وہ خود پوچھے گا جب خود پوچھے گا، اس کو بتا دیا جائے گا، وہ عمل بھی کرے گا۔ اللہ اسی طرح ان لوگوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتا ہے جو سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اب ذرا دیکھ لیں میرے خیال میں اس میں ایک بہت گُر کی بات ہے ﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الروم: 59) مطلب یہ کہ عقل سے کام لینا، سمجھ سے کام لینا، علم کو استعمال کرنا اگر اس سے کوئی کام نہیں لیتا اس کا منفی اثر دل پر پڑتا ہے۔ میں نے پہلے بھی اس پہ بات کی کہ عقل سے اس کو سمجھایا جائے کہ آپ کیا کر رہے ہیں اگر وہ عقل کی بات نہیں مانتے تو پھر کیا ہوتا ہے؟

دلوں پہ ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے۔ مجھے علم اس لیے دیا گیا کے میں اس پر عمل کروں، حجت تمام ہو گئی ہے اب اگر میں اس پر عمل نہیں کرتا تو میں عقل سے کام نہیں لیتا اور یہ ایک گناہ ہے اور ہر گناہ کا اثر دل پر پڑتا ہے کیونکہ علم سے کام نہ لینا بھی ایک گناہ ہے اس گناہ کا اثر دل پر پڑے گا دل پہ نقطہ پڑے گا اور عین ممکن ہے کہ اس سے بالکل ہی ہدایت سے محروم ہو جائے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ (الروم)

ترجمہ: "لہٰذا (اے پیغمبر) تم صبر سے کام لو یقین جانو اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ایسا ہر گز نہیں ہونا چاہیے کہ جو لوگ یقین نہیں کرتے ان کی وجہ سے تم ڈھیلے پڑ جاؤ" یعنی آپ ﷺ کے سامنے دو چیزیں تھیں ایک اللہ پاک کی بات اور ایک مخلوق کی حالت، تو پیغمبر کا کام ہوتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی بات ہوتی ہے وہ مخلوق تک پہنچائے اور مخلوق کی باتوں سے اثر نہ لے کیونکہ مخلوق کی حالت تو بگڑی ہوئی ہے اور ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ان لوگوں کی باتوں پہ صبر کرو کیونکہ یہ تو balanced نہیں ہیں مطلب یہ تو بگڑے ہوئے ہیں تو ان کی باتوں پہ صبر کر لو اور جو اللہ پاک آپ کے ساتھ وعدہ کر رہا ہے وہ سچا ہے اس پر یقین ہونا چاہیے اور تمہارا عمل اس کے مطابق ہو جو اللہ تعالیٰ نے تجھے فرمایا ہے اسی کے مطابق عمل کرو۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ اللہ نے جو وعدے کیے ہیں ان وعدوں پر سچے ہونے کا یقین کر لیں اور لوگوں سے اثر نہ لیں۔ ہم لوگوں کے درمیان رہ رہے ہیں تو یہ کوئی طریقہ نہیں کہ ہم کہیں کہ فلاں آدمی بھی ایسا کر رہا ہے تو میں بھی ایسا کروں گا، اگر فلاں آدمی کنویں میں چھلانگ لگا رہا ہے تو کیا تم بھی کنویں میں چھلانگ لگاؤ گے؟ تم دیکھو کہ اس کا کام کیسا ہے؟ اگر اچھا کام ہے اور قابل اتباع ہے تو تم بھی اتباع کر لو اور اگر برا کام ہے تو اس کو رہنے دو۔

مثال کے طور پر ایک آدمی اپنی صحت کا خیال رکھ رہا ہے تو اسے دیکھ کر مجھے بھی اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے لیکن ایک آدمی زہر کھا رہا ہے تو کیا میں اس کو دیکھ کر زہر کھانا شروع کر دوں؟ یعنی دوسروں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے بلکہ جو حق ہے، اس سے متاثر ہونا چاہیے چاہے وہ خود اپنے اندر ہو یعنی اللہ کی طرف سے خود ودیعت کیا گیا ہو یا چاہے دوسروں سے ہم لے رہے ہوں، لیکن حق کا اتباع ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق پر جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔

مطالعہ سیرت بصورت سوال

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ ۝

سوال:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ﷺ جب کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے۔ اس حدیث شریف کی روشنی میں وہ کون سے ذرائع ہیں جن کو استعمال کر کے ہم نیک اعمال پر مداومت اختیار کر سکتے ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں جو ہمارے لئے مداومت اختیار کرنے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں؟

جواب:

اس سوال میں آپ ﷺ کی عادت مبارکہ بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ جب کبھی کوئی عمل شروع کرتے تھے تو اس کو دوام یعنی ہمیشگی کے ساتھ کرتے تھے، اِلَّا یہ کہ کوئی ایسی مجبوری پیش آجاتی کہ جس کی وجہ وہ کام چھوڑنا پڑ جاتا، جیسے بیماری یا کوئی اور مجبوری۔ بہر حال آپ ﷺ یہ پسند فرماتے تھے کہ جب بھی کوئی عمل شروع کریں تو دائمی طور پہ کریں۔ اس میں سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کرنی چاہیے کہ فرائض و واجبات پر عمل پیرا ہونا اور حرام اور مکروہات سے بچنا ایک دائمی امر ہے، جن پر کار بند رہنا ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے۔ کیونکہ ان کی خلاف ورزی گناہ گار ہونے کا باعث ہے۔ لہذا آپ ﷺ سے یا صحابہ کرام سے ایسی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان امور میں دوام نہیں کرتے ہوں گے۔ لہذا یہ طے شدہ بات ہے کہ اوامر و نواہی میں اس حوالے سے کوئی فرق نہیں ہے۔ جیسے کوئی آدمی ایک دن پانچ نمازیں پڑھے اور دوسرے دن چار پڑھے، پھر کبھی چھ پڑھ لے اور کبھی دو پڑھ لے، تو یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ فرائض و واجبات میں نہ زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کمی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح حرام کاموں میں بھی choice نہیں ہوتی، بلکہ وہ بھی ہمیشہ کے لئے مستقل طور پر due ہیں، ان سے بچنا ہر حال میں ضروری ہے۔

گویا دوام والی بات زائد امور میں ہے، جیسے نفلی امور یا مستحبات۔ اور مباحات میں بھی انہماک مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ بھی مکروہ کے ساتھ ملانے والی چیز ہے۔ چنانچہ مباحات میں بھی دوام نہیں ہو سکتا۔ لہذا مستحبات و نوافل اور زائد امور میں یہ سنت ہے کہ جو کام بھی کسی نے شروع کیا ہو تو اگرچہ اس کو اختیار ہے کہ وہ بعد میں کرے یا نہ کرے لیکن پسندیدہ یہ ہے کہ اس عمل کو دائمی طور پر جاری رکھے۔ مثلاً ایک آدمی تہجد نہیں پڑھتا تو علیحدہ بات ہے کہ یہ مستحب امر ہے، لہذا اگر کوئی نہیں پڑھتا تو اس کو اجر نہیں ملے گا اور نہ کرنے پر اس کو کوئی گناہ نہیں ہو گا اور نہ کوئی سزا ہو گی اور اس کی برکات بھی نہیں ملیں گی۔ لیکن جب پڑھنا شروع کرے تو اس کو چھوڑنے کی بجائے پڑھتا رہے جو ایک اچھی عادت ہے۔ اب یہ سوال کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو انسان کو دوام سے ہٹا سکتے ہیں؟ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسان اپنے نفس پر اتنا بوجھ نہیں ڈالے جتنا وہ اٹھا نہ سکتا ہو، جیسے ایک شخص بیس کلو وزن پانچ منٹ کے لئے آسانی سے اٹھا سکتا ہو، لیکن اگر وہ دو کلو وزن ایک میل تک اٹھا کر لے جانا چاہے گا تو وہ اس کے مقابلے میں مشکل ہو گا حالانکہ بیس کلو وزن زیادہ ہوتا ہے اور اس میں زیادہ مشقت کرنی پڑتی ہے، لیکن یہ تب ہوتا ہے جب وہ تھوڑی دیر کے لئے اٹھائے، لیکن اگر زیادہ دیر کے لئے ہو تو تھوڑا بوجھ بھی مشکل ہو جاتا ہے، اس کے برعکس اگر آہستہ آہستہ وزن بڑھایا جائے تو کم محسوس ہو گا۔ مثلاً پہلے دو کلو لے جائے، پھر چند دنوں کے بعد ڈھائی کلو لے جانا شروع کر دے، پھر تین کلو لے، پھر ساڑھے تین کلو، پھر چار کلو لے جانا شروع کر دے، تو عین ممکن ہے کچھ عرصے کے بعد بیس کلو لے جانا اس کے لئے مشکل نہ ہو۔ جیسے مزدور لوگ بیچارے یہی کرتے ہیں، بلکہ پہاڑی علاقوں کے لوگ بیس کلو کے توڑے کے ساتھ ہاتھ میں کوئی اور چیز بھی پکڑ کر پہاڑوں پر چڑھتے ہیں اور نیچے بھی اترتے ہیں۔ وہ کیسے کرتے ہوں گے؟ جب کہ فاصلہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور ساتھ مزید سامان بھی ہوتا ہے، اور پھر کسی اور چیز کی رسائی بھی نہیں ہوتی کہ اس کے ساتھ کوئی ہمت کرائے یا اس کی مدد کرے۔ بس شروع کرتے ہیں تو چلتے رہتے ہیں۔ اور مکان بھی دور دور ہوتے ہیں، کیونکہ پہاڑی علاقوں میں قریب قریب مکان نہیں ہوتے۔ تو اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو کوئی مدد کرنے والا نہیں ہوتا۔ لیکن ان لوگوں کی اتنی پریکٹس ہوتی ہے کہ وہ کبھی پرواہ نہیں کرتے اور یہ کام ان

کا معمول ہے۔ لیکن ہمارے لئے وہ بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ تدریجی عمل کے ذریعے سے انسان پختگی پیدا کر سکتا ہے۔ بعض لوگ کچھ انفعالی طبیعت کے ہوتے ہیں کہ جیسے کسی کو دیکھا کہ یہ اچھی بات ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ کام شروع کر لیں گے۔ جیسے یہ ورزش اور چہل قدمی کرنے والے بعض لوگ بڑے پُر جوش ہوتے ہیں کہ شروع میں ہی پانچ میل تک چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن جب اگلی دفعہ دیکھیں تو لیٹے ہوتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے بندے استقامت سے کام لینا چاہیے تھا۔ جیسے کہا جاتا ہے: "اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ" لہٰذا اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی تدریج کے ساتھ چلے اور رہنمائی میں چلے، رہنمائی سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنے نفس کی کمزوری خود نظر نہیں آتی، دوسروں کو نظر آ جاتی ہے، کیونکہ اس کے ساتھ اس کی انفعالیت اور جذباتیت اور اس طرح کی دوسری چیزیں ہوتی ہیں جو انسان کے فیصلوں پر اثر ڈالتی ہیں جب کہ دوسرے میں وہ نہیں ہوتیں، لہٰذا وہ ایک تحقیقی نظر سے اس کو دیکھتے ہیں۔ دوسرا اگر تجربہ کار ہو تو اس کی نظر نسبتاً کافی متوازن ہوتی ہے، لہٰذا وہ آپ کو وہی بتائے گا جو آپ کے لئے مفید ہو۔ ورنہ بعض دفعہ انسان اپنے اوپر زیادتی کر بیٹھتا ہے، اور اتنا کام نہیں کر سکتا جتنا اپنا ٹائم ٹیبل بناتا ہے، نتیجتاً اس کا ٹائم ٹیبل ٹوٹ جاتا ہے، اور جب ایک دفعہ ٹوٹتا ہے تو انسان اٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور جب دوسری دفعہ ٹوٹتا ہے تو پھر بھی انسان کوشش کرتا ہے، لیکن جب تین چار دفعہ ٹوٹتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا، لہٰذا معاملہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شیطان نے ایسی رکاوٹ لگا دی کہ اب آپ اُٹھ ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ میری اسکیم فیل ہو گئی۔ لیکن اصل اسکیم فیل نہیں ہوئی۔ بلکہ یوں سمجھیں میں نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا وہ غلط تھا، لہٰذا میں اس تجربے سے فائدہ اٹھا کر کسی تجربہ کار کا سہارا لوں اور اس کے ساتھ مشورہ کروں کہ میں نے یہ کام کرنا تو ہے لیکن کس طرح کروں؟ چنانچہ وہ آپ کو اس کا طریقہ کار بتا دے گا، سمجھا دے گا جس سے آپ ان شاء اللہ کامیاب ہو جائیں گے۔ ایک دفعہ میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں گیا، میرے چچا زاد کا ایک بیٹا تھا جو میٹرک کا امتحان نہیں دینا چاہتا تھا، مجھے اس کے والدین نے کہا کہ اس کو سمجھائیں، اس نے تیاری چھوڑ دی ہے۔ میٹرک کا امتحان نہیں دے رہا، کہتا ہے میں پاس نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کو بلا لیا اور

اس سے کہا: تم امتحان کیوں نہیں دے رہے ہو؟ حالانکہ ہماری عمر میں اتنا زیادہ فرق نہیں تھا صرف دو تین سال کا فرق تھا۔ کہنے لگا مجھے یاد نہیں ہوتا، میں نے کہا جھوٹ کہتے ہو، تو اسے غصہ آگیا کہ آپ نے میرے اوپر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا ہے۔ میں نے کہا ہاں بالکل! اگر ثابت کردوں تو پھر؟ کہنے لگا ثابت کرو۔ میں نے کہا یہ بتاؤ اگر آپ ایک کتاب پہلی دفعہ میں پڑھتے ہیں اور پانچ گھنٹے میں ختم کر لیتے ہیں، لیکن دوسری دفعہ پڑھیں تو کتنی دیر میں ختم ہو گی؟ کہنے لگا ممکن ہے تین گھنٹے میں ہی ہو جائے۔ میں نے کہا اور اگر تیسری دفعہ پڑھو گے تو کتنی دیر میں ہو گی؟ کہتا ہے ممکن ہے ایک گھنٹے میں ہو جائے۔ میں نے کہا یہ بتاؤ کہ اگر تیسری دفعہ آپ ایک گھنٹے میں پڑھ لیتے ہو تو یہ چار گھنٹے جو بچت ہو گی یہ کیوں ہوئی ہے؟ یہ مجھے سمجھا دو۔ تو چپ ہو گیا۔ میں نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ آپ کو اتنا یاد ہو گیا ہے لیکن آپ اس کو بائی پاس کر رہے ہیں۔ گویا یہ آپ کو یاد ہوا ہے۔ کہتا ہے ہاں! میں نے کہا: آپ کہتے ہیں مجھے یاد نہیں ہوتا تو یہ جھوٹ بولا تھا ناں؟۔ خیر وہ چپ ہو گیا۔ پھر میں نے کہا آپ نے امتحان دینا ہے اور طریقہ میں بتاتا ہوں۔ اب میں آپ کو پڑھنے کا طریقہ بتاتا ہوں، بعد میں آپ کو امتحان میں پرچہ حل کرنے کا طریقہ بتاؤں گا۔ بہر حال میں نے اس کو پڑھنے کا طریقہ بتایا، اور الحمد للہ وہ ابھی بطور انجینئر ریٹائر ہوا ہے۔ لہذا وہ ایک طریقہ کار تھا، کیونکہ اس کو اپنی کمزوری کا پتا نہیں تھا۔ اور یہ کمزوریاں بہت سارے لوگوں میں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ تجربے سے ان کمزوریاں کو دور کیا جاتا ہے۔ مینیجرز اسی لئے ہوتے ہیں کہ ہر کسی کی صلاحیت کو دیکھ کر اس کے مطابق ان کو کام دینا اور پھر اس کے مطابق اس کی نگرانی کرنا، کیونکہ وہ ان ساری چیزوں سے واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح سے کام ہوتے ہیں اور دفتر کے کام اس طرح ہی چلتے ہیں۔ اس ساری بات کا حاصل یہ ہے اگر انسان تدریج کے ساتھ چلے تو دوام حاصل کر سکتا ہے لہذا ایک دفعہ ایک مقام حاصل کر لے، پھر تدریجاً پختگی پیدا کرے، پھر وہ چلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کو مشکل پیش نہیں آتی۔ البتہ طبیعتوں میں فرق ہوتا ہے بعض طبیعتیں جلدی پختگی پیدا کر لیتی ہیں جو ان کی فطری عادات ہوتی ہیں وہ لیتے ہی اتنا ہیں جتنا وہ کر سکتے ہوں، اور پھر جب وہ کرتے ہیں تو تسلسل کے ساتھ کرتے ہیں۔ یعنی وہ آسانی سے کسی چیز کے بارے قائل نہیں ہوتے لیکن جب قائل ہو جائیں تو اس سے ہٹتے

نہیں۔ ہمارے ایک بھائی ہیں اگر وہ کوئی کام شروع کر لیں تو ان سے چھوٹتا نہیں، پھر وہ بہر صورت کرتے ہیں۔ اور نہ کرنا ہو تو وہ صاف انکار کر دیں گے میں نہیں کر سکتا۔ گویا ان کے اندر فطری طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اس پر تو بحث کریں گے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں، لیکن جب کوئی شروع کر لیا تو وہ درمیان میں چھوڑتے نہیں۔ یہ بہت اچھی صلاحیت ہوتی ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ اس کا ذہن کیا ہے؟ وہ کس کام کے حوالے سے اس طرح کرتا ہے کیونکہ برائی بھی تو ہوتی ہے، انسان کوئی بھی کام شروع کر سکتا ہے، اچھائی بھی شروع کرتا ہے۔ لہذا یہ اس کے دل کی بات ہوتی ہے کہ وہ کس چیز کو شروع کرتا ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ برائی کے لئے بھی نفس کو کنٹرول کیا جاتا ہے یعنی عقلی برائی کے لئے۔ جیسے سیاست دان کتنی زیادہ تکالیف نفس پہ برداشت کرتے ہیں!! تاہم اس کے لئے وہ کیسے مستقل مزاج ہوتے ہیں، بہت استقامت کے ساتھ پتا نہیں کیا کچھ کرتے ہیں۔ جیلیں برداشت کرتے ہیں، اور بہت سی تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ یہ میں نے صرف ایک مثال دی اس قسم کی اور بھی بہت ساری مثالیں ہیں۔ گویا بعض دفعہ انسان کسی چیز کو عقلی طور پر چاہتا ہے لیکن طبعی طور پر اس کے لئے وہ تیار نہیں ہوتا، بلکہ اس کو خود مستقل مزاجی سے کرنا ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے لیکن عقلی طور پر وہ چاہتا ہے کہ مجھے ایسا ہونا چاہیے۔ جس کے لئے وہ لمبے لمبے منصوبے بناتا ہے اور اس میں پختگی بھی پیدا کرتا ہے۔ جیسے سارے باطل مذاہب کے لوگ کتنی محنت کرتے ہیں؟ بلکہ شیطان کو دیکھیں کہ کتنا مستقل مزاج ہے؟ ایسا مستقل مزاج ہے کہ آپ کو خراب کرنا چاہے گا تو یہ نہیں سوچے گا کہ چلو ایک طریقے سے نہیں ہوا تو چھوڑ دوں، بلکہ اگر ایک طریقے سے نہیں تو دوسرے طریقے سے، دوسرے طریقے سے نہیں تو تیسرے طریقے سے، تیسرے سے نہیں تو چوتھے سے خراب کرنے کی کوشش کرے گا۔ یعنی کسی نہ کسی طریقے سے آپ کو خراب کر ہی دے گا۔ گویا یہ بھی اس کی مستقل مزاجی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی کے لئے بھی ایسا ہو سکتا ہے اور اچھائی کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا اگر کسی کو پختگی کی صلاحیت نصیب ہو کہ وہ جلدی پختہ ہو جاتا ہے تو اسے اچھائی کے لئے پختہ ہونا چاہیے نہ کہ برائی کے لئے۔ اس کے لئے پھر مزید محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا ان تمام چیزوں میں حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات حجت ہے، حضرت

نے فرمایا کہ تصوف کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ صحیح عقائد پر پختگی حاصل ہو جائے اور صحیح اعمال پر استقامت نصیب ہو جائے اور نفس کی ایسی تربیت کی جائے کہ یہ دونوں آسان ہو جائیں۔ لہذا عقلی کمزوری بھی دور کی جائے، نفس کو بھی قابو کیا جائے اور دل کی حالت بھی بہتر کی جائے اور یہی تصوف ہے۔ یہی کام کرنا ہوتا ہے اور یہ کسی کی نگرانی میں کرنا ہوتا ہے، کیونکہ بغیر شیخ کے یہ چیزیں مشکل ہیں اس لئے شیخ کے پاس جانا ضروری ہوتا ہے اور اس کی ماننی ہوتی ہے اور اس کے ماننے میں استقامت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ گویا بہت ساری چیزوں میں استقامت پیدا کرنے کے لئے اس ایک استقامت کو استعمال کیا جاتا ہے کہ میں نے شیخ کی بات ماننی ہے، یعنی یہ ایک استقامت بہت ساری استقامتوں کا پیش خیمہ ہے۔ مثلاً آپ بہت ساری بیماریوں کا علاج کرا رہے ہوں تو اگر آپ کہیں کہ میں نے ایک ڈاکٹر کی بات ماننی ہے، تو آپ کی بہت ساری بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے، لیکن اگر آپ کہیں کہ میں نے اس بیماری میں ڈاکٹر کی بات ماننی ہیں اور اس میں نہیں ماننی تو آپ کا علاج نہیں ہو سکتا۔ لہذا اگر آپ اپنے مصلح کی بات ماننے میں استقامت پیدا کر لیں تو یہ بہت ساری اصلاحوں کا راستہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے آج تک تمام طریقوں میں سب حضرات یہی بات کرتے ہیں شیخ کی بات مانو، شیخ کی بات مانو۔ یعنی اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو قابو کرنے میں اس چیز کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ اس کو عقلی طور پر بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، نیز یہ مستقل تجربہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اچھے کاموں پے دوام حاصل کرنے کے لئے اور برے کاموں سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرما دے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تعلیمات مجددیہ رحمۃ اللہ علیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ ۝

الحمد للہ، اگرچہ ان مکتوبات کا ایک دور مکمل ہو چکا ہے اور تمام مکتوبات کی تشریح ہو چکی ہے، تاہم مکتوبات کی اہمیت کے پیش نظر ان مکتوبات شریفہ کے درس کا ایک نیا دور شروع کیا گیا ہے جو منتخب مضامین پر مشتمل ہیں۔ سب سے اہم چونکہ عقائد ہیں اس لئے فی الحال عقائد پر ہی بات ہو رہی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ عقائد پر مشتمل جلد دوم کا مکتوب نمبر 67 اور سوم کا مکتوب نمبر 17 الحمد للہ ہو چکے ہیں اور یہ عوام کے لئے تھے اور مکتوب نمبر 266 حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان کی طرف لکھا گیا تھا اسی لئے اس میں علمی مضامین زیادہ پائے جا رہے ہیں اور کلامی موضوعات زیادہ ہیں۔ لہذا ہم نے اس کو بعد میں رکھا تھا تاکہ پہلے عوام کی بات ہو جائے پھر مزید تفصیلات اس مکتوب شریف میں آ جائیں گی اور یہ کافی طویل مکتوب شریف ہے۔ تو اب اللہ کا نام لے کر اس کو شروع کرتے ہیں۔ اس میں جو عقائد کے متعلق حصہ ہے ہم صرف اسی کو لے رہے ہیں کیونکہ اس میں ہمارا مقصد صرف عقائد کا بیان ہے۔ جہاں تک باقی تفصیلات ہیں تو چونکہ مختلف مضامین کے حوالے سے بات ہو رہی ہے اس لئے جہاں جس مضمون کا ذکر آئے گا وہاں اس پر بات ہو گی۔ ان شاء اللہ۔

متن:

حضرت پیر زادگان خواجہ عبد اللہ و خواجہ عبید اللہ کی طرف صادر فرمایا۔

عقیدہ نمبر1:

تشریح:

عوام کے عقائد کے متعلق جو مکتوبات شریف ہیں، ان میں بھی یہ چیزیں گزر چکی ہیں، لیکن اس میں ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ چیزیں آ رہی ہیں۔

متن:

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات مقدس کے ساتھ خود موجود ہے، اور تمام اشیاء اس

تعالیٰ کی ایجاد سے موجود ہیں۔

تشریح:

چونکہ اللہ جل شانہ کی ذات کسی بھی چیز کی محتاج نہیں ہے، اس لئے اللہ جل شانہ کی موجودگی خود اپنی ذات سے ہے، کوئی اور اس کے لئے ذریعہ بن ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ پھر محتاجی کی بات آ جائے گی اور اللہ تعالیٰ محتاج نہیں ہے، مثلاً ہم کسی بھی چیز کو لے لیں وہ محتاج ہو گی جیسے پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن کا محتاج ہے کیونکہ ہائیڈروجن آکسیجن مل کے پانی بنتا ہے۔ اسی طرح عمارت اینٹوں، ریت، سیمنٹ اور کئی چیزوں کی محتاج ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ کی ذات کسی چیز کی بھی محتاج نہیں ہے اور چونکہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ لہٰذا مخلوق اپنے خالق کی ذات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکتی البتہ صفات کے بارے میں جان سکتی ہے۔ کیونکہ صفات کا اثر مخلوق تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے حکم ہوا ہے کہ صرف صفات میں غور کرو، مخلوقات میں غور کرو، اللہ کی ذات پہ غور نہ کرو۔ کیونکہ اللہ پاک کی ذات کو آپ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے، سمجھنا ناممکن ہے۔ تو ناممکن چیز کے اندر غور کرنا اپنے آپ کو بیمار کرنے والی بات ہے یا ملحد کرنے والی بات ہے۔ اس لئے انسان خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو خراب کرے۔

متن:

اور تمام اشیاء اس تعالیٰ کی ایجاد سے موجود ہیں۔ اور حق تعالیٰ اپنی ذات و صفات اور افعال میں یگانہ ہے۔

تشریح:

یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی صفات اس طرح نہیں ہیں جس طرح اللہ کی صفات ہیں یعنی جیسے اللہ کا دیکھنا ہے، اللہ کا سننا ہے، اللہ کا علم ہے، کسی اور کی یہ صفات اس طرح نہیں ہو سکتیں۔ تو اللہ جل شانہ ان میں ہر قسم کے شرک سے پاک ہیں یعنی کوئی بھی دوسرا ان میں اللہ کے ساتھ برابری نہیں کر سکتا نہ ذات میں، نہ صفات میں اور نہ افعال میں۔

متن:

اور فی الحقیقت کسی امر میں بھی خواہ وجودی ہو یا غیر وجودی، کوئی بھی اس کے ساتھ

شریک نہیں ہے۔

تشریح:

وجودی اور غیر وجودی کی تفصیل آگے وحدت الوجود کی بحث آ رہی ہے۔ جس میں یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد نہیں ہے۔یہاں اسی طرف اشارہ ہے کہ چاہے وجودی چیز ہو یا غیر وجودی، کسی بھی چیز میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

متن:

(اس کی جناب میں) مشارکت اسمی اور مناسبت لفظی بحث سے خارج ہے۔

تشریح:

یعنی اللہ جل شانہ کے نام کی طرح بھی کوئی نہیں ہو سکتا ہے یعنی نہ حقیقت کے لحاظ سے کوئی شریک ہے اور نہ ہی لفظ کے لحاظ سے۔ یعنی یہ ساری چیزیں شرک سے پاک ہیں۔

متن:

اللہ سبحانہ کی صفات اور افعال اس کی ذات کی طرح بے چون اور بے چگونہ ہیں۔

تشریح:

اللہ جل شانہ کی جتنی بھی صفات ہیں مثلاً اللہ پاک کریم ہے، اللہ پاک رحیم ہے، لیکن کتنا کریم ہے؟ کتنا رحیم ہے؟ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہے؟ کیونکہ غیر متناہی چیز کا کوئی ادراک نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی بھی کوئی تفصیل معلوم نہیں کر سکتا اس لئے وہ بے چون و بے چگونہ ہیں کیونکہ اس کی طرح کوئی اور ہے ہی نہیں، نہ کوئی ایسی مثال ہے۔ لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ پاک رحیم ہے اور انسان بھی رحیم ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک کریم ہے انسان بھی کریم ہو سکتا ہے۔ لیکن اللہ پاک کے کریم ہونے اور انسان کے کریم ہونے میں بہت فرق ہے، کیونکہ انسان محتاج ہے اور کریم ہے اور اللہ تعالیٰ محتاج نہیں ہے، اللہ پاک کے پاس جو کچھ ہے اس میں کمی نہیں ہو سکتی۔ جیسے آپ بڑے سے بڑے سخی کو لے لیں، اور اس سے مانگیں کہ یہ دے دو، وہ دے دے گا، پھر مانگو گے، دے دے گا، پھر مانگو گے، دے دے گا۔ بالآخر کسی وقت کہہ دے گا کہ بس، اس سے زیادہ نہیں۔ ایسے نہیں ہو سکتا ہے کہ آدمی کہہ دے کہ ٹھیک ہے جتنا

مانگو میں دوں گا کیونکہ وہ تو محتاج ہے اور محدود ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ سے جتنا چاہے مانگو پابندی نہیں ہے، بلکہ وہ نہ مانگنے پہ ناراض ہوتے ہیں، البتہ دیتے اپنی حکمت سے ہیں۔ یعنی "نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ" جیسے انسان اس بات سے متاثر ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اس سے متاثر نہیں ہوں گے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اللہ پاک اپنی حکمت کے مطابق جو بھی کرنا چاہیں کر دیتے ہیں۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (البقرۃ: 26) "بے شک اللہ نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کرے مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے" یعنی اللہ پاک کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ پاک محتاج نہیں ہیں۔ لہٰذا اللہ جل شانہ کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اللہ پاک کی صفات اور اللہ کے افعال بے چون و بے چگونہ ہیں۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ ایک تو وہ صفات ہیں جو اس کی ذات کا حصہ ہیں جیسے اللہ پاک کیسے دیکھتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے صفت نہیں ہے، تو اس کے بارے تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اللہ پاک کی ذات میں غور کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ جب آپ کہتے ہیں اللہ پاک کیسے دیکھتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہاں اللہ پاک دیکھتے ہیں، یہ صفت ہے۔ کیسے دیکھتے ہیں؟ یہ ذات کے بارے میں ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات معلوم ہیں، اللہ تعالیٰ کی صفات کے ذریعے سے انسان اللہ کی معرفت بھی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کا کوئی ادراک نہیں کر سکتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (الانعام: 103) "اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے" البتہ صفات کے بارے میں آدمی ادراک کر سکتا ہے اس لئے صفات کے بارے میں غور کرنے کا حکم ہے۔ البتہ اس میں ایک عجیب لطیف نکتہ ہے کہ معرفت صفات کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے لیکن جس کا محبت کا معاملہ ہے یعنی صفت میں جو فنائیت ہے وہ محدود ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنائیت غیر محدود ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اس کی ذات میں فنا ہونا فنائے کاملہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں فنا ہونا فنائے ناقصہ ہے کیونکہ وہ واپس آ سکتا ہے۔ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفت ہے رزاق یعنی رزق دینے والا۔ اب کسی کو بہت رزق مل رہا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ رزاق میں فنا ہو گیا کہ

اللہ پاک ایسا رزاق ہے چنانچہ وہ ہر وقت اس کے گن گاتا ہے، گویا اس کو اللہ کے ساتھ محبت ہو گئی رزاقیت کی وجہ سے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ حکمت کی وجہ سے کبھی رزق کھینچ لے تو وہ پہلے والی حالت میں پہ چلا جائے گا اور محبت کی ساری باتیں کرکری ہو جائیں گی۔ تو یہ شخص کامل نہیں ہے۔ میں صرف سمجھانے کے لئے ایک مثال عرض کرتا ہوں ورنہ اس کا اور کوئی مقصود نہیں ہے۔ جیسے ایک شخص کسی پیر سے بیعت ہوتا ہے لیکن اس کے ذہن میں اپنا کوئی خاص دنیاوی مقصد ہے جس کے لئے وہ بیعت ہوتا ہے۔ اب جب تک اس کا وہ مقصد حاصل ہوتا ہے تو پیر اچھا ہے اور جب وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو ساری بات آگے پیچھے ہو جائے گی۔ اور اس کو اس پیر سے اصل فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ اصلاح کے لئے بیعت ہی نہیں ہوا جو پیر سے بیعت ہونے کا اصل مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ بعض مشائخ امتحان بھی لے لیتے ہیں کہ یہ واقعی مجھ سے بیعت ہے یا نہیں ہے، اور ان کو حق بھی ہے۔

کہتے ہیں ایک دفعہ کسی پیر صاحب کے پاس بہت زیادہ بھیڑ ہو گئی، بہت زیادہ لوگ آ گئے تو وہ کہنے لگے کہ میں اتنے لوگوں کی تربیت نہیں کر سکتا، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے، میں صرف مخصوص لوگوں کی تربیت کروں گا جس کے لئے شرط یہ ہے جو میری بات پہ عمل کرنے سے پہلے نہ سوچے وہ میرا مرید ہو گا اور جو سوچے گا وہ میرا مرید نہیں ہو گا۔ بڑی کڑی شرط لگائی۔ لوگوں نے کہا ٹھیک ہے۔ تو انہوں نے کہا کون ہے جو میرے لئے جان دے سکتا ہے؟ ایک آدمی کھڑا ہو گیا اس کو کہا اوپر جاؤ، اس کو بالا خانے پہ بھیج دیا، تھوڑی دیر کے بعد پرنالے وغیرہ کے پائپ سے خون آنے لگا، پھر پوچھا کوئی اور شخص ہے؟ تو ایک اور اٹھا اور وہ بھی اوپر چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر کچھ خون آ گیا۔ تیسری دفعہ کہا کہ جی کوئی اور ہے؟ تو ایک تیسرا آدمی اٹھا، لیکن وہ راستے ہی میں چیخ مار کر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا جس کے بعد پھر کوئی اور نہیں اٹھا۔ تو حضرت نے فرمایا کہ نیچے آ جاؤ۔ تو جو اوپر گئے تھے وہ نیچے آ گئے اور ان کے پاس بکروں کے سر تھے یعنی بکرے ذبح ہوئے تھے وہ خون ان بکروں کا آ رہا تھا۔ حضرت نے فرمایا دیکھو کہ یہ میرے ڈھائی مرید ہیں 2 کامل ہیں اور ایک آدھا ہے کہ کم از کم اٹھا تو تھا۔ بس میرے ذمے ان کی اصلاح ہے، باقی رخصت ہو جاؤ۔ یوں سب کو رخصت کر دیا۔

میں آپ کو اس کا مقصد بتاتا ہوں، اسلام کا کیا معنی ہے؟ اسلام کا معنی ہے غیر مشروط طور پر اللہ پاک کے سامنے سلامی ہو جانا، اس میں کوئی شرط نہیں لگانی کہ میرا یہ کام ہو گا تو میں مسلمان ہوں گا۔ کوئی شرط نہیں، بس جو بھی ہو میں مسلمان ہوں۔ یہ صحیح معنوں میں اعتقادی اسلام ہے اور جب انسان کیفیتاً حالاً، قالاً ہر طرح سرِ تسلیم خم کرے تو وہ حقیقی مسلمان ہو جاتا ہے۔ یعنی جسے ہم مقامِ تسلیم کہتے ہیں جب وہ کسی کو حاصل ہو جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے اس کا ادراک کسی کو نہیں ہو سکتا لہٰذا اللہ جل شانہ کے سامنے سلامی ہونے کے دو مراحل اور ہیں ایک تو آپ ﷺ کے سامنے سلامی ہونا کہ آپ ﷺ کی سنت پر بغیر تامل کے عمل کرنا اور دوسرا یہ ہے کہ سنت پہ چلنے کے لئے شیخ کی بات ماننا۔ لہٰذا آدمی شروع شیخ سے کرتا ہے۔ تو جب تک سلامی ہونے کی وہ کیفیت نہیں ہو گی اس وقت تک وہ آگے کیسے جائے گا؟ خیر یہ بات کافی لمبی ہو گئی۔ تو بات چل رہی تھی کہ اللہ جل شانہ اپنی صفات میں یگانہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال اور اس کی ذات بے چون و بے چگونہ ہے، اس کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی کیونکہ اللہ جل شانہ کی ذات وراء الوراء ہے لہٰذا اللہ پاک کی صفات اور اس کے افعال بھی بے چون و بے چگونہ ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ذات کا پتا ہی نہیں چل سکتا۔ صفات کا پتا چل سکتا ہے لیکن تفصیلات کا علم نہیں ہے اور ہم لوگوں کو ان کا مکمل احاطہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بے چون و بے چگونہ ہیں۔ البتہ اس کے ذریعے سے معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔

متن:

اور ممکنات کی صفات اور افعال کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔

تشریح:

یعنی مثلاً اللہ کے رحیم ہونے اور انسان کے رحیم ہونے میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

متن:

مثلاً صفت العلم اس سُبْحَانَہٗ کی ایک صفت قدیم اور بسیط حقیقی ہے جس میں "تعدد اور تکثر" کو ہر گز دخل نہیں ہے، اگرچہ وہ تکثر تعدد تعلقات کے اعتبار سے ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ وہاں ایک ہی بسیط انکشاف ہے کہ ازل و ابد کی معلومات اسی انکشاف سے منکشف ہوتی ہیں۔

تشریح:

یہ بہت ہی زبردست بحث ہے۔ ہمارے شیخ حضرت مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی کو ذکر سکھا رہے تھے تو فرمایا کہ جب "اللہُ اللہ" کا ذکر کرو تو اس کے ساتھ یہ تصور کرو کہ عرش سے ایک نور آپ کے اوپر آ رہا ہے پھر مثال دی کہ اس وقت تم یہ سمجھتے ہو ناں کہ میں پشاور میں ہوں؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ پھر فرمایا: یہ سمجھتے ہو ناں کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں؟ اس نے کہا: جی بالکل۔ فرمایا: یہ سمجھتے ہو کہ میں فلاں خاندان سے ہوں؟ اس نے کہا: جی بالکل۔ فرمایا: یہ سمجھتے ہو کہ پٹھان ہوں؟ اس نے کہا: جی بالکل۔ پھر فرمایا یہ ساری باتیں ایک ہی وقت میں سمجھتے ہو ناں؟ یہ تو نہیں کہ 5 بج کر 10 منٹ پٹھان ہونے کو سمجھتے ہو، اور 5 بج کر 11 منٹ پر میں پشاور میں ہونے کو اور 5 بج کر 12 منٹ پر میں فلاں کا بیٹا ہونے کو سمجھتے ہو۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آنِ واحد میں ہی یہ ساری چیزیں سمجھ رہے ہو۔ یہ تو ایک انسان کی بات ہے جو ایک ہی وقت میں ان تمام چیزوں کو جانتا ہے چاہے ان کا ظہور مختلف اوقات میں ہو، مثلاً اس کا پشاور میں ہونا وغیرہ ان ساری چیزوں کا علیحدہ علیحدہ ظہور ہے۔ لیکن ایک ہی وقت میں وہ جانتا تو ہے مثلاً میں کیمسٹری کا ماہر ہوں اب کیمسٹری کا جتنا بھی علم مجھے مستحضر ہے، تو عین ممکن ہے کہ میں ایک چیز ایک وقت میں لکھوں، دوسری چیز دوسرے وقت میں لکھوں، تیسری تیسرے وقت میں لکھوں اور کبھی general messages پیش کر دوں، کبھی کتاب میں لکھوں، لیکن وہ ایک وقت میں مستحضر اور موجود تو ہے۔ اسی طرح اللہ جل شانہ کے ہاں حال، مستقبل اور ماضی ہے ہی نہیں، وہ زمان و مکان میں مقید نہیں ہے، زمان و مکان کو اسی نے بنایا ہے۔ لہٰذا ماضی حال مستقبل سب اس کے لئے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جا بجا مستقبل میں آنے والی چیزیں کو "کَانَ" کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے حالانکہ "کَانَ" ماضی کے لئے ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے لئے ماضی، حال اور مستقبل ایک جیسے ہیں۔ اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی چیز بعد میں ہونے والی ہے۔ کیونکہ وہ پہلے سے اللہ کے علم میں ہے۔ اور فعل کا وقوع بھی بالکل اس کے علم کی طرح ہے یعنی جس طرح علم کا ذریعہ آن واحد میں ایک ہے اسی طرح فعل کا ذریعہ بھی آن واحد میں ایک ہے۔ البتہ جیسے علم کا ظہور مختلف اوقات میں ہوتا ہے اسی طرح افعال کا ظہور بھی مختلف اوقات

میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بحث اللہ جل شانہ کی صفتِ علم کے بارے میں ہے جس میں بڑی تفصیل ہے لیکن میرے خیال میں اصل بات سمجھ میں آگئی ہو گی۔

متن:

اس تحقیق سے واضح ہو گیا کہ حق تعالیٰ کا علم اگرچہ تغیر پانے والی جزئیات سے متعلق ہو لیکن اس کے علم میں تغیر کا شائبہ بھی راہ نہیں پاتا اور حدوث کا گمان اس کی صفت میں پیدا نہیں ہوتا۔

تشریح:

یعنی اس کی صفت میں کوئی حدوث نہیں ہے البتہ اس کے ظہور میں جو مختلف واقعات ہو رہے ہیں ان میں حدوث ہے۔ یعنی کبھی ایک چیز ظاہر ہو رہی ہے، کبھی دوسری چیز ظاہر ہو رہی ہے اور کبھی تیسری چیز ظاہر ہو رہی ہے لیکن اس کی صفت میں کوئی حدوث نہیں ہے وہ اپنی جگہ پر ایک مستقل چیز ہے۔

متن:

جیسا کہ فلاسفہ نے زعم (غلط دعوی) کیا ہے، کیونکہ تغیر اسی تقدیر پر متصور ہو سکتا ہے جبکہ ایک کو دوسرے کے بعد جانا ہو، اور جب سب کو آنِ واحد میں جان لے تو پھر تغیر و حدوث کی گنجائش نہیں ہے۔ پس اس کی کوئی حاجت نہیں ہے جب ہم اللہ تعالی کے مطابق تعلقات کا اثبات کر لیں تاکہ تغیر و حدوث ان تعلقات کے ساتھ راجع ہو، نہ کہ صفت علم کی طرف۔

تشریح:

یعنی حدوث تعلقات کے ساتھ تو سکتا ہے لیکن علم کے ساتھ نہیں۔

متن:

جیسا کہ بعض متکلمین نے فلاسفہ کے شبہ کو دور کرنے کے لئے کیا ہے۔ ہاں اگر معلومات کی جانب تعدد تعلقات کا اثبات کریں تو اس کی گنجائش ہے۔ اور اسی طرح ایک کلام بسیط ہے

تشریح:

یہ کلام کے لحاظ سے بھی بات ہو گئی۔

متن:

جو ازل سے ابد تک اسی ایک کلام کے ساتھ گویا (ناطق) ہے۔ اگر "امر" ہے تو وہ بھی وہیں سے پیدا ہوا ہے اور اگر "نہی" ہے تو وہ بھی وہیں سے ہے اور اگر اعلام (خبر) ہے تو بھی وہیں سے ماخوذ ہے اگر استفہام ہے تو وہ بھی وہیں سے، اگر تمنی یا ترجی ہے (آرزو کرنا۔ امید رکھنا) تو وہ بھی وہیں سے مستفاد ہے، تمام نازل شدہ کتابیں اور بھیجے ہوئے صحیفے اس "کلام بسیط" کا ایک ورق ہیں، اگر "توریت" بھی "انجیل" بھی (اور قرآن بھی) اور اسی طرح ایک ہی فعل ہے اور اسی ایک فعل کے ذریعے اولین و آخرین کی مصنوعات وجود میں آ رہی ہیں (جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے) ﴿وَمَآ اَمۡرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ﴾ (القمر:50) "اور ہمارا حکم بس ایسا یکبارگی ہو جائے گا جیسے آنکھ جھپکانا"۔ اس آیت کریمہ میں (اس حقیقت مذکورہ کی طرف) اشارہ ہے کہ اگر زندہ کرنا یا مارنا ہے تو وہ اسی ایک فعل سے مربوط ہے۔ اور اگر ایلام (تکلیف) ہے یا انعام ہے تو وہ بھی ایک فعل سے (منوط) ملا ہوا ہے، اگر ایجاد (بنانا) ہے یا اعدام (مٹا دینا) ہے تو وہ بھی اسی فعل سے پیدا ہوا ہے، لہذا حق سُبحانہ و تعالیٰ کے فعل میں بھی تعدد تعلقات ثابت نہیں ہے بلکہ ایک ہی تعلق سے مخلوقات اولین و آخرین اپنے وجود کے اوقات مخصوصہ میں وجود پذیر ہو رہی ہیں اور یہ تعلق بھی حق تعالیٰ کے فعل کی مانند بے چون و بے چگونہ ہے کیونکہ چون کو بے چون کے ساتھ کوئی راہ نہیں ہے۔

تشریح:

یعنی اگر آپ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کے ذریعے سے اس کو سمجھ گئے ہیں جیسے پہلے علم کا میں نے بتایا تھا تو باقی اس کے اوپر آپ قیاس کر سکتے ہیں۔ سب اللہ پاک ہی کی صفات ہیں تو اگر ایک کے بارے میں آپ کو پتا چل گیا کہ وہ ایک وقت میں موجود ہیں اور بعد میں اس سے ساری چیزیں اپنے اپنے وقت پر ظہور میں آ رہی ہیں تو اسی طرح سے فعل بھی ہے۔ مثال کے طور پر میں کوئی مکان بنا رہا ہوں تو اس میں میں نے ارادہ

کیا کہ میں یہ کروں گا، یہ کروں گا، یہ کروں گا، تو یہ علم ہے اور اس کی جو استعداد ہے وہ بھی موجود ہے، تو ساری چیزیں اکٹھی موجود ہیں اب صرف یہ ہے کہ جیسے وہ علم وقتاً فوقتاً وجود میں آسکتا ہے اسی طرح وہ عمل بھی وقتاً فوقتاً وجود میں آسکتا ہے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ چونکہ تمام چیزوں سے بے نیاز ہے، اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر بہت سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان سوالات کا جواب دینا ممکن نہیں رہتا۔ کیونکہ مثلاً اگر آپ کہیں کہ بعد میں جب فعل وجود میں آیا تو تب اللہ کو علم ہوا۔ تو اس سے یہ ثابت ہوا اللہ کو پہلے اس کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ کلامی موضوعات میں ایسے ہی ہوتا ہے کہ اس میں اگر آپ ایک طرف سے تھوڑی سی غفلت کریں تو بہت سارے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

اب آگے آپس میں علمی یعنی کلامی بحث شروع ہو گئی ہے۔

متن:

اشعری چونکہ حق جل سلطانہ کے فعل کی حقیقت سے واقف نہ تھے اس لئے تکوین کو حادث کہہ دیا۔

تشریح:

جیسے ابھی تک میں نے جتنی بھی بات کی وہ تکوین پہ کی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی صفتِ تکوین کو حادث کہہ دیا، کیونکہ تکوین بذاتِ خود تو حادث ہے یعنی کائنات کا بننا حادث ہے۔ کیونکہ قرآن پاک خود بتاتا ہے کہ 6 دنوں میں یہ کائنات بنائی ہے۔ لہذا اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ صفتِ تکوین حادث نہیں ہے بلکہ وہ باقی صفات کی طرح قدیم ہے۔

متن:

اور اس سبحانہ کے افعال کو بھی حادث جان لیا

تشریح:

یعنی چونکہ افعال تکوین سے آتے ہیں تو افعال کو بھی حادث جان لیا۔

متن:

اور انہوں نے یہ نہیں جانا کہ یہ سب حق سبحانہ کے فعلِ ازلی کے آثار ہیں نہ کہ اس تعالیٰ کے افعال۔

تشریح:

یعنی یہ اللہ کے افعال نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فعل کے اثرات ہیں، اور اثر ظل ہے کیونکہ وہ اس سے وجود میں آتا ہے۔

متن:

اور اسی قبیل سے یہ ہے کہ بعض صوفیا جنہوں نے تجلیٔ افعال کا اثبات کیا ہے اور اس مقام میں ممکنات کے افعال کے آئینے میں (یعنی ممکنات میں جو افعال ہو رہے ہیں ان کے ذریعے سے یعنی ان کی روشنی میں سمجھ کر) سوائے فعل واحد جَلَّ سُلْطَانُہٗ کے کچھ نہیں دیکھا، وہ تجلی حقیقت میں حق سُبْحَانَہٗ کے فعل کے آثار کی ایک تجلی ہے نہ کہ اس تعالیٰ کے فعل کی تجلی، کیونکہ اس تعالیٰ کے فعل کو جو بے چون و بے چگونہ ہے اور قدیم ہے اور اس تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے جس کو "تکوین" کہتے ہیں، محدثات کے آئینے میں اس کی گنجائش نہیں اور ممکنات کے مظاہر میں اس کا کوئی ظہور نہیں۔

تشریح:

اس سے پتا چلا کہ جیسے پہلے حضرت نے جو بات ارشاد فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال اس کی ذات کی طرح بے چون و بے چگونہ ہیں، تو چونکہ اس میں باقی صفات کے مقابلے میں تکوین ہی زیادہ تر زیر بحث آتی ہے کیونکہ اس کا تعلق نزول کے ساتھ ہے لہذا اگر تکوین کی یہ حالت ہے کہ وہ بھی بے چون و بے چگونہ ہے تو پھر باقی صفات کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

متن:

اس فقیر کے نزدیک افعال و صفات کی تجلی ذات تعالیٰ و تقدس کی تجلی کے بغیر متصور نہیں ہے۔

تشریح:

یہ بہت بڑا علم ہے جو میں ابھی عرض کر رہا ہوں اس کو سمجھنا چاہیے۔ در اصل اللہ تعالیٰ کی صفات کے ذریعے سے ہم اللہ پاک کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں، لیکن ان صفات کا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے وہ اس کی ذات ہے اس کو ہم صفات نہیں کہیں گے۔ مثلاً اللہ کیسے دیکھتا ہے؟ یہ ذات کی بات ہے صفت کی بات نہیں ہے۔ ہمیں دیکھ رہا ہے بس یہ صفت ہے۔ یعنی وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں اس کا ہمیں پتا ہے۔ لیکن کیسے دیکھتے ہیں؟ یہ اس کی ذات کی بات ہے۔ لہذا جو ذات کے ساتھ ہے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا وہ بے چون و بے چگونہ ہے۔ تو افعال کی تجلی کے متعلق یہ فرمایا کہ یہ بے چون و بے چگونہ ہے، کوئی اس کا ادراک نہیں کر سکتا اور اس میں تجلی ذات ہے اس کے ساتھ تجلی صفت متصل ہے۔ اس لئے فرمایا:

متن:

اس فقیر کے نزدیک افعال و صفات کی تجلی ذات تعالی و تقدس کی تجلی کے بغیر متصور نہیں ہے۔

تشریح:

یعنی آپ اس کو ذات سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔

متن:

کیونکہ افعال و صفات، حضرت ذات تعالیٰ و تقدس سے جدا نہیں ہیں تاکہ ان کی تجلی ذات کی تجلی کے بغیر متصور ہو سکے اور جو کچھ ذات تعالیٰ و تقدس سے جدا ہے وہ اس سبحانہ کی صفات و افعال کے ظلال ہیں۔

تشریح:

یعنی خود وہ نہیں ہیں۔ افعال کی تجلی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے لیکن اس سے جو اثر پیدا ہوا ہے وہ آثار کی بات ہے، یعنی next میں اس سے جو چیز ظہور میں آ رہی ہے گویا جس کا ہمارے ساتھ تعلق ہے اور جس کا ہم ادراک کر سکتے ہیں وہ ظلال ہے اور جس کا ہم ادراک نہیں کر سکتے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ اس حوالے سے یہ کافی

اہم نکتہ ہے ورنہ ساری بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا ہے کہ میجر حسین صاحب نے اس پہ سوال پوچھا تھا تو ان کو میں نے کچھ جواب دیا تھا۔ وہ اصل میں اسی بحث کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ تو یہاں بھی وہ چیز آ گئی۔

متن:

اور جو کچھ ذات تعالیٰ و تقدس سے جدا ہے وہ اس سبحانہ کی صفات و افعال کے ظلال ہیں، لہذا ان کی تجلی افعال و صفات کے ظلال کی تجلی ہوئی نہ کہ افعال و صفات کی تجلی۔ لیکن ہر شخص کی سمجھ اس کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔

تشریح:

یعنی میں نے کچھ سوچا کہ کچھ بولوں، وہ جو سوچا ہے اس کو کوئی دیکھ سکتا ہے؟ تو جو بولا ہے اس کو لوگ سنتے ہیں۔ تو جو سوچا ہے وہ کیا ہے اور جو بولا ہے وہ کیا چیز ہے؟ جو سوچا ہے اس کا تعلق ذات کے ساتھ ہے اور جو بولا ہے وہ اس کا ظہور ہے۔ اسی طرح جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے اس کا کوئی ادراک نہیں کر سکتا اور اس کے بعد جو اس کا ظہور ہوا ہے وہ ظلال ہے، چنانچہ اس کا ادراک ہو سکتا ہے بہر حال کوئی اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتا، بس یہی بنیادی بات ہے کیونکہ domain ہی مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی خارج میں موجود ہے، باقی چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارادے کے ساتھ استقرار پا چکی ہیں، اور وہ اصل میں موجود ہی نہیں ہیں، بلکہ اصل میں معدوم ہیں، لیکن اس کو موجود کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ اصل میں موجود ہے۔ یہی واجب الوجود اور ممکنات میں فرق ہے کہ ممکن واجب الوجود کے ارادے سے ہوا ہے اور اس نے استقرار پایا ہے تو دونوں ایک جیسے کہاں ہو سکتے ہیں، ایک ہونا نا ممکن ہے۔

متن:

اور جو کچھ ذات تعالیٰ و تقدس سے جدا ہے وہ اس سبحانہ کی صفات و افعال کے ظلال ہیں۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (الجمعہ:4) "یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے"۔

عقیدہ (2): اب ہم اصل بات کی طرف رجوع ہوتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز

میں حلول نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی چیز اس میں حلول کر سکتی ہے لیکن وہ تعالیٰ "محیطِ اشیاء" ہے (یعنی تمام اشیا کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے) اور ان کے ساتھ قرب و معیت رکھتا ہے، اور وہ احاطہ قرب و معیت ایسا نہیں ہے جو ہماری فہمِ قاصر میں آ سکے کیونکہ یہ (بات) اس تعالیٰ کی جناب قدس کے شایان شان نہیں ہے۔ اور (صوفیا) جو کچھ کشف و شہود سے معلوم کرتے ہیں وہ تعالیٰ اس سے بھی منزہ ہے۔ کیونکہ ممکن (بشر وغیرہ) کو حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال کی حقیقت سے سوائے جہل و نادانی اور حیرت کے کچھ نصیب نہیں ہے۔ غیب پر ایمان لانا چاہیے اور جو کچھ مکشوف و مشہود ہوا اس کو لا کی نفی کے تحت لانا چاہیے۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں
کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را
(اٹھا لے جال، شکار عنقا محال
بس یہاں جال کا یہی ہے مآل)

تشریح:

یعنی اس کو آپ پا ہی نہیں سکتے۔ حضرت کا ایک مکتوب شریف ہے جس میں حضرت نے ایک خواب کی تعبیر دی ہے جس میں تُرک قصاب کا تذکرہ آتا ہے۔ وہ بڑا زبردست واقعہ ہے۔ اس میں حضرت آخر میں فرماتے ہیں کہ وہ جب پہاڑ کے اوپر پہنچے تو دیکھا کہ خیمے میں بادشاہ نہیں تھا تو فرمایا ہاں ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کا کوئی ادراک نہیں کر سکتا، اس کا وصال ایسا نہیں ہے۔ یہاں بھی یہی بات ہے کہ ہم جس کو متصل سمجھتے ہیں اور جس کو معیت سمجھتے ہیں، جو الفاظ ہمارے domain کے لئے بنے ہوئے ہیں وہ اللہ کے domain کے لئے استعمال ہی نہیں ہو سکتے، اللہ جل شانہ کے لئے ان الفاظ کا استعمال جائز ہی نہیں ہے۔ البتہ عربی کا لفظ "ک" بہت کام کی چیز ہے جیسے "کَاَنَّکَ تَرَاہ" یعنی دیکھ تو نہیں سکتا لیکن "کَاَنَّکَ" ایسے ہے جیسے تو دیکھ رہا ہے۔ یعنی آپ کے اوپر اس کا ایسا اثر ہو جیسے آپ دیکھ رہے ہو۔ لیکن یہ اثر کیسے ہو گا؟ اثر کرنے کے لئے ایک ہے اثر کو بڑھانے والی چیز اور دوسری وہ چیز ہے جو اثر کے بڑھنے میں مزاحمت کرنے والی ہے تو اثر

کو بڑھانے والی چیز کو بڑھاؤ اور اثر کو کم کرنے والی چیز کو کم کرو۔ جمع کو جمع سے ضرب دو اور منفی کو منفی سے ضرب دو، تو دونوں جمع ہو جائیں گی۔ اس میں ایمان بالغیب کی بات ہے یعنی اس ایمان کی قوت کو بڑھا دو، کیونکہ ایمان تو نہیں بڑھتا ایمان "لَا یَزِیدُ وَلَا یَنْقُصُ" ہے۔ لیکن ایمان کی قوت بڑھ سکتی ہے۔ یہ بھی بڑی عجیب بحث ہے، ایک مثال نے اس کو بہت آسان کر دیا ہے کہ جیسے ایک شخص مر رہا ہے تو اگر کوئی پوچھے کہ یہ زندہ ہے یا مردہ ہے؟ وہ کیا کہے گا؟ جب تک اس کی روح نہیں نکلی تو وہ یہی کہے گا کہ ابھی زندہ ہے اور ایک پہلوان ہے جو ہاتھ سے پتا نہیں کیا کیا چیزیں اٹھاتا ہے اور بھی بڑے بڑے کار نامے انجام دیتا ہے، اگر اس کے بارے میں کوئی پوچھے کہ زندہ ہے یا مردہ ہے؟ تو کیا جواب ہو گا؟ یہی ہو گا کہ زندہ ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ حالانکہ دونوں زندہ ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے، زندہ ہونے کے لحاظ سے دونوں ایک جیسے ہیں، لیکن قوت کے لحاظ سے دونوں ایک جیسے نہیں ہیں۔ اس لئے ایمان کی تعریف میں کوئی فرق نہیں ۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان اور ایک عام گناہ گار آدمی کا ایمان ایک جیسا ہے، لیکن قوت دونوں کی ایک جیسی نہیں ہے۔ جو ایمان بالغیب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تھا، اس کی جو قوت تھی، کیا کسی گناہ گار کے ایمان کی طاقت اتنی ہو گی؟ گناہ گار کے ایمان کی طاقت تو اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ اس کو گناہ سے روک سکے۔ نیز ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان اتنا طاقت ور ہے کہ وہ سارا گھر خالی کر دیتے ہیں، جھاڑو پھیر دیتے ہیں اور سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھتے ہیں گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ وہ کہتے ہیں یا رسول اللہ گھر والوں کے لئے اللہ اور اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کافی ہے، میں سب کچھ لے آیا ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ جو ایک زبردست ولولہ انگیز صحابی تھے، ان دنوں ان کے پاس کچھ مال بھی تھا تو نصف لے آئے، نصف گھر کے لئے چھوڑ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا گھر والوں کے لئے کچھ چھوڑا ہے؟ فرمایا جی! نصف چھوڑ آیا ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ اس دن بڑے خوش تھے کہ میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جیت جاؤں گا، لیکن وہاں جا کر معاملہ دیکھا تو انہوں نے کہا کہ ان سے جیتنا محال ہے۔ یہ ایمان کی بات ہے۔ گویا جو ایمان بالغیب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تھا وہ باقی لوگوں کو کہاں حاصل ہے، عمر رضی اللہ عنہ نے بھی جواب دے دیا تھا کہ میں ان کی طرح نہیں ہو سکتا تو باقی لوگوں کی کیا بات ہو گی۔ لہذا جس طرح

ہم یہاں ایمان کے بارے میں بات کر رہے ہیں اسی طرح وہ تصور جو ایمان بالغیب کے ذریعے سے آتا ہے اس کو بڑھانا ہے، یعنی ایمان بالغیب تو ہے کہ اللہ موجود ہے اور اللہ ہر جگہ موجود ہے اور میں اللہ کے سامنے ہوں، لیکن کیا یہ تصور مجھ پر اتنا مسلط ہے؟ ایک تو اس کو بڑھانا ہے، اس کو بڑھانے کے لئے آپ مراقبات کریں یا ذکر اذکار کریں، جتنا کر سکتے ہو کرو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چونکہ ہمیں ان مراقبات کے اثرات سے روکنے والی چیز ہمارا نفس یا نفس کی خواہشات ہیں، کیوں کہ اگر میری توجہ کسی اور طرف جا رہی ہے تو اس وجہ سے جا رہی ہے کہ اس چیز کے ساتھ میرا دل لگا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دل کیوں لگا ہوا ہے؟ کیونکہ نفس نے اس کی خواہش پیدا کی ہے۔ لہذا جب تک آپ اس نفس کی اصلاح نہیں کر سکتے اور اسے مطمئن نہ بنا سکے اس وقت تک آپ وہ چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ گویا کہ یہ اس میں مسلسل کمی کر رہا ہے۔ لہذا ایک طرف ایمان بالغیب کو بڑھانا ہو گا اور دوسری طرف نفس کی خواہش کے معاملے کو کم کرنا ہو گا۔ چنانچہ جب آپ اس کو کم سے کم کر لیں یا نفسِ مطمئنہ بنا دیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے تو ان دونوں چیزیں کے مجموعے سے آپ کو کیفیتِ احسان حاصل ہو سکتی ہے اور یہی معرفت اور عبدیت ہے، کیونکہ نفسِ مطمئنہ عبدیت ہے اور معرفت اللہ تعالیٰ کی پہچان ہے۔ تو یہ دونوں مل کر کیفیتِ احسان کو پیدا کرتی ہیں۔

متن:

لیکن وہ تعالیٰ "محیط اشیاء" (یعنی تمام اشیاء کو محیط ہے) اور ان سے قریب ہے، اور ان کے ساتھ ہے لیکن اس احاطہ اور قرب و معیت کے معنی (و حقیقت) اس تعالیٰ کے ساتھ کیا ہیں وہ ہم نہیں جانتے۔

تشریح:

یعنی ہم جانتے ہیں کہ اللہ میرے ساتھ ہے لیکن کیسے ہے یہ نہیں جانتے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ﴿إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ﴾ (الشعراء: 62) اور آپ ﷺ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ: 40) لیکن یہ معیتِ رب کیسے ہے، اس کا کوئی ادراک نہیں کر سکتا۔ لیکن معیت ہے۔ اسی طرح محیط ہونا بھی ایسے ہی ہے۔

متن:

عقیدہ (3): اور حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہے اور اسی طرح کوئی چیز بھی اس سبحانہ کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی۔ اور بعض صوفیا کی عبارات سے جو کچھ اتحاد کا مفہوم لیا جاتا ہے وہ ان کی مراد کے خلاف ہے کیونکہ ان کی مراد اس کلام سے جس سے اتحاد کا وہم ہوتا ہے۔ (اور وہ ہے) "اِذَا تَمَّ الْفَقْرُ فَهُوَ اللّٰه" سے یہ ہے کہ جب فقر تمام ہو جائے اور نیستی محض (فنائیت) حاصل ہو جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، نہ یہ کہ وہ فقیر خدائے تعالےٰ کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے اور خدا بن جاتا ہے کیونکہ یہ کفر اور زندقہ ہے

تشریح:

یعنی خدا تو کیا بننا وہ جو تھا وہ بھی نہیں رہا، تو خدا کیسے بن گیا، خدا تو بن نہیں سکتا بلکہ وہ جو تھا اس کی بھی اس نے نفی کر لی تو وہ چیز بھی ختم ہو گئی۔ مثلاً میں اپنے آپ کو ایک ذرہ سمجھتا تھا اور ترقی کر کے میں اپنے آپ کو خدا سمجھوں "نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ" تو یہ میں نے اپنا فائدہ کیا یا نقصان؟ یہ تو میں نے کفر کیا۔ لہذا اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں پر تو خدا کے لئے اپنے آپ کو فنا کرنا ہے، پھر آپ کی نظر اللہ پر ہی پڑے گی، کسی اور پر نہیں پڑے گی، وہ نظر جس کا میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا تھا کہ جب انسان کو فنائیت حاصل ہو گئی تو نفس کا نام و نشان نہیں رہا، جب نام و نشان نہ رہے تو اس کی نظر اپنے اوپر نہیں پڑے گی، جیسے میں نماز پڑھتا ہوں نماز میں بھی مجھے نفس اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن جب میرے نفس کو فنائیت حاصل ہو جائے گی تو اللہ اکبر کے ساتھ میں کہاں پہنچوں گا؟ ظاہر ہے اللہ پاک کے پاس پہنچوں گا۔ کیونکہ رکاوٹ ڈالنے والی چیزیں ختم ہو گئیں، لہذا میں براہِ راست کیفیتاً اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل کر سکتا ہوں اس کے قریب ہو سکتا ہوں، لیکن حقیقتاً نہیں، کیونکہ قرب کیفیتاً ہے، معیت کیفیتاً ہے، یہ سب کیفیتاً ہے حقیقتاً نہیں ہے۔ جیسے میں نے کیفیتِ احسان کی بات کی تھی وہ بھی حقیقتاً نہیں ہے کیفیتاً ہے یعنی وہ کیفیتِ احسان ہے۔ چنانچہ جس کو فنائے نفس حاصل ہو گئی تو گویا اس وقت وہ اپنے آپ کو فنا کر چکا ہے جب فنا کر چکا ہے تو اس کی نظر اب اللہ پہ پڑ گئی، جب نظر اللہ

پہ پڑ گئی تو وہ اپنے آپ کو بھول گیا اور اللہ جل شانہ ہی کو یاد رکھا، نتیجتاً اس وقت وہ خود چونکہ ہے نہیں اس لئے اس کی زبان سے جو نکلے گا وہ اس کے الفاظ نہیں ہوں گے۔ جب تک وہ ہوش میں نہیں آیا یعنی اس کو بقا والا نیا جامہ نہیں پہنایا گیا اس وقت تک اس کی جو باتیں بھی ہوں گی شطحیات ہوں گی اس کی اپنی باتیں نہیں ہوں گی۔ جیسے خواب میں کوئی بات کرتا ہے تو کیا اس بات کا کوئی اعتبار ہوتا ہے؟ یا نشے میں کوئی بات کرتا ہے تو اس کا کوئی اعتبار ہوتا ہے؟ کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو سکر (نشے) کی حالت میں ہے اس کی باتوں کا اعتبار نہیں ہے، وہ اس کی باتیں نہیں ہیں، لہٰذا اس کے ساتھ ہم حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ یہ اس کی باتیں نہیں ہیں، وہ اس وقت مقتدا نہیں بن سکتا کیونکہ اس کی یہ باتیں شریعت کے مطابق نہیں ہیں لیکن بہر حال معذور ہے۔ جیسے جب ہم جرمنی میں تھے تو ٹرین میں ہم سفر کرتے تھے تو دو امریکی سپاہی ٹرین میں تھے، ایک نے شراب پی ہوئی تھی اور دوسرا اس کے ساتھ تھا، جس نے شراب پی تھی وہ غل غَپاڑہ کر رہا تھا جیسے شرابی کرتے ہیں، دوسرا لوگوں سے اس کے لئے معافی مانگ رہا تھا کہ Sorry he is sick، میں معافی چاہتا ہوں آپ برا نہ منائیں، یہ اس وقت بیمار ہے۔ اور sick اس کو کہتے ہیں جس نے شراب پی ہوتی ہے۔ لہٰذا sick یعنی سکر والی حالت میں، وہ اپنے آپ میں تھا ہی نہیں۔ صبح کے وقت ہم جارہے تھے تو ایک بہت اعلیٰ لباس پہننے والا یقیناً کوئی اچھے خاندان کا ہو گا، وہ اپنے آپ کو نالی میں ڈال رہا تھا اور اس کے ساتھ جو دوسرا آدمی تھا وہ اس کو بچا رہا تھا کہ وہ خود کو نالی میں نہ ڈالے، بس وہ اس نشے میں تھا، اس کو پتا ہی نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لہٰذا نشے کی حالت میں کہی ہوئی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ ہاں اگر وہ خود ہوش میں آجائیں تو پھر کہتا ہے کہ اوہ! یہ میں نے کیا کر دیا، پھر افسوس کرتا ہے۔

متن:

"تَعَالَی اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ عَمَّا یَتَوَھَّمُ الظَّالِمُونَ عُلُوًّا کَبِیْرًا" "اللہ تعالیٰ سبحانہ ظالموں کے وہم و گمان سے بہت بلند اور بڑا ہے"، اور ہمارے حضرت خواجہ (باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ) قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ انا الحق سے یہ مراد نہیں ہے کہ "میں حق ہوں" بلکہ مطلب یہ ہے کہ "میں نہیں ہوں حق سبحانہ موجود ہے"۔

عقیدہ (4): اور تغیر و تبدل کو اس تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں کوئی راہ نہیں

ہے "فَسُبْحَانَ مَنْ لَّا يَتَغَيَّرُ بِذَاتِهٖ وَلَا بِصِفَاتِهٖ وَلَا فِيْ اَفْعَالِهٖ بِحُدُوْثِ الْاَكْوَانِ" "پس پاک ہے وہ ذات جو اپنی ذات و صفات اور افعال میں کائنات (موجودات) کے حدوث (حوادث) سے متغیر نہیں ہوتی"، اور جو کچھ صوفیہ وجودیہ نے تنزلاتِ خمسہ کے بارے میں اثبات کیا ہے وہ مرتبہ وجوب میں تغیر و تبدل کی قسم سے نہیں ہے کیونکہ وہ کفر و گمراہی ہے بلکہ ان تنزلات کو حق تعالیٰ کے کمال کے ظہورات کے مراتب میں اعتبار کیا ہے بغیر اس بات کے کہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں کوئی تغیر و تبدل راہ پائے۔

تشریح:

یعنی "نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ" اللہ پاک خود نیچے نہیں آیا، چھوٹا ظاہر نہیں ہوا، بلکہ اللہ جل شانہ نے اپنی تجلی اس طرح ظاہر کی کہ لوگ اس کو برداشت کر سکیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی تبدیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے بات ہوئی ہے کہ صفات میں بھی تبدیلی نہیں ہوتی تو ذات میں کیسے تبدیلی ہو گی، ذات تو صفات سے بھی بہت بالا ہے۔ لہذا اگر کوئی یہ کہے کہ ذات میں تبدیلی ہو رہی ہے تو یہ گمراہی اور کفر ہے۔

متن:

عقیدہ (5): اور حق تعالیٰ اپنی ذات و صفات اور افعال میں غنی مطلق ہے اور کسی امر (کام) میں بھی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے اور جس طرح وجود میں محتاج نہیں ہے اسی طرح ظہور میں بھی محتاج نہیں ہے

تشریح:

ظہور میں بھی محتاج نہیں ہے، ظہور، کیا چیز؟ اصل میں وہ تو انسان کے لحاظ سے ہے اللہ کی بات نہیں ہے۔ در اصل اللہ جل شانہ نے یہ جو کلام فرمایا یہ ہماری سمجھ کے مطابق کیا ہے، تو یہ تجلی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حال کے مطابق کلام فرمایا کہ ہم اس کو سمجھ سکیں۔ کیونکہ اللہ جل شانہ اگر اپنی شان کے مطابق بات کرتے تو کوئی بھی نہ سمجھ سکتا۔ جیسے عربی مبین ہے، اب اللہ کو تو عربی کی ضرورت نہیں تھی، ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ اسی طرح یہ بات کہ یہ بڑا موزوں کلام ہے، اللہ کو اس کی ضرورت نہیں

تھی، ہمیں ضرورت ہے۔

متن:

اور حق تعالیٰ اپنی ذات و صفات اور افعال میں غنی مطلق ہے اور کسی امر (کام) میں بھی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے اور جس طرح وجود میں محتاج نہیں ہے اسی طرح ظہور میں بھی محتاج نہیں ہے اور یہ جو بعض صوفیہ کی عبارات سے مفہوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے اسمائی و صفاتی کمالات کے ظہور میں ہمارا محتاج ہے۔ یہ بات فقیر پر بہت گراں ہے بلکہ جانتا ہے کہ ان (مخلوق) کی پیدائش سے مقصود خود ان کے اپنے کمالات کا حاصل ہونا ہے نہ کہ وہ کمال جو حق تعالےٰ و تقدس کی بارگاہ کی طرف عائد ہو سکے۔ آیہ کریمہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: 56) "اَیْ لِیَعْرِفُوْنِ" "اور میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی معرفت کے لئے" اس سے مقصود صرف معرفت کا حصول ہے جو کہ ان کے لئے کمال ہے، نہ یہ کہ ایسا امر جو حق سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف عائد ہو سکے۔ اور یہ حدیث قدسی میں آیا ہے: "**فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ**" "میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ میں پہچانا جاؤں" اس جگہ بھی ان کی اپنی معرفت مراد ہے۔

تشریح:

یعنی وہ مجھے پہچان لیں، اس لئے نہیں کہ مجھے کوئی فائدہ ہو جائے گا۔ یعنی اس کی نسبت بھی آپ مخلوق کی طرف کریں گے خالق کی طرف نہیں کریں گے کہ خالق کو پہچانے جانے کی ضرورت تھی۔ جیسے ایک specialist کسی گاؤں میں جاتا ہے اور کوئی آ کر اس سے پوچھتا ہے کوئی مشورہ کرتا ہے تو کیا specialist کو اس کی ضرورت ہے؟ اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس شخص کو ضرورت ہے۔ اب اگر specialist کہتا ہے میں اس لئے آیا تاکہ آپ کی ضروریات پوری کروں تو بالکل صحیح کہتا ہے اور اگر وہ کہہ دے کہ میں اس لئے آیا کہ میری ضرورت پوری ہو جائے تو اس کی ضرورت ہے ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، مخلوق کو ضرورت ہے اور مخلوق ساری کی ساری محتاج ہے۔

متن:

عقیدہ (6): حق تعالیٰ نقص کی تمام صفتوں (اقسام) اور حدوث کے تمام نشانات سے منزہ اور مبرا ہے، جس طرح وہ جسم و جسمانی نہیں ہے مکانی و زمانی بھی نہیں ہے بلکہ تمام صفات کمال اسی کے لئے ثابت ہیں، جن میں سے آٹھ صفات کمال وجود ذات تعالیٰ و تقدس پر وجود زائد کے ساتھ موجود ہیں۔ اور وہ آٹھ صفات: حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور تکوین (پیدا کرنا) ہیں، اور یہ صفات خارج میں موجود ہیں، اور ایسا نہیں ہے کہ وجود ذات پر وجود زائد کے ساتھ علم میں موجود ہیں اور خارج میں نفس ذات تعالیٰ و تقدس ہیں جیسا کہ بعض صوفیہ وجودیہ نے گمان کیا ہے۔

کیونکہ اس میں درحقیقت صفات کی نفی ہے اس لئے صفات کی نفی کرنے والے یعنی معتزلہ اور فلاسفہ نے بھی تغائر علمی اور اتحاد خارجی کہا ہے اور تغائر علمی سے انکار نہیں کیا۔

تشریح:

یہ بہت زبردست بحث ہے۔ یعنی یہ صفات خارج میں موجود ہیں۔ خارج اس کو کہتے ہیں جو ذہن سے باہر حقیقت میں بھی موجود ہو۔ مثلاً میں نے کوئی چیز سوچی تو اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے، اور جب اس سوچ کے مطابق میں نے کوئی کام کر لیا مثلاً کچھ الفاظ کہے یا کچھ چیز بنائی تو وہ خارج میں موجود ہے۔ پشتو میں کہتے ہیں کہ بات نے زبان سے کہا تہ ما د خلي نہ اوباسہ زہ تا د خار نہ اوباسم تم مجھے منہ سے نکالو میں تجھے شہر سے نکلواتی ہوں۔ کیونکہ جو لفظ آپ کی زبان سے نکل گیا وہ اب آپ کا نہیں رہا اب وہ public کا ہو گیا، اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر جب تک آپ نے اس پر بات نہیں کی تو وہ بات آپ کے پاس تھی اور کسی کو پتا نہیں تھا کہ آپ کے پاس کیا ہے۔ لیکن جب یہ بات باہر آگئی تو یہ تیری نہیں رہی بلکہ یہ public کی ہو گئی۔ مثلاً آپ نے کسی کو گالی دی تو گالی دینے کے بعد آپ کیا کر سکتے ہیں؟ وہ تو زبان سے نکل گئی، اب وہ دوسرے کی بات ہے۔ جیسے کہتے ہیں شیر کے منہ میں بکری آ جائے تو بکری کیا کرے؟ اب تو جو کچھ کرنا ہے شیر نے کرنا ہے بکری نے کیا کرنا ہے، بکری تو اس کے منہ میں چلی گئی۔ اسی

طرح اگر کسی کے پاس pistol ہے اور تمہاری زبان سے گالی نکلی اور اس کے pistol کی نالی سے گولی نکلی تو آپ کیا کریں گے۔ بس جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اسی طرح صفات وجود زائد کے ساتھ ہیں یعنی صفات اپنے طور پر خارج میں exist کر رہی ہیں۔ خارج سے مراد ہے کہ یعنی ذہن میں نہیں ہیں خارج میں ہیں۔ البتہ ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ اس کی ذات کا حصہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کیسے کلام فرماتے ہیں؟ کیسے سنتے ہیں؟ یہ سب اس کی ذات کا حصہ ہے لیکن صفات زائد وجود کے لحاظ سے خارج میں موجود ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ ذات کے لحاظ سے کہیں گے تو یہ صفات کا انکار ہے، کیونکہ جو خارج میں موجود نہ ہو اس کا تو سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا۔

سوال:

صفات کے متعلق کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ صفات کے دو رخ ہیں، ایک رخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور دوسرا مخلوق کی طرف۔

جواب:

اس پہ پہلے بھی بات ہوئی ہے اور ابھی بھی یہ بات ہوئی ہے کہ اللہ پاک کیسے دیکھتے ہیں، یہ اس کی ذات کا حصہ ہے، لیکن خود دیکھنا خارج میں موجود ہے لہذا وہ صفات خارج میں موجود ہیں، کیونکہ اگر آپ یہ نہیں کرتے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہی مراد لیتے ہیں تو پھر اللہ موجود ہے کوئی اور چیز موجود ہی نہیں۔ یوں تو صفات سے انکار ہو گیا۔

متن:

اور خارج میں نفس ذات تعالیٰ و تقدس ہیں جیسا کہ بعض صوفیہ وجودیہ نے گمان کیا ہے۔ کیونکہ اس میں درحقیقت صفات کی نفی ہے اس لئے صفات کی نفی کرنے والے یعنی معتزلہ اور فلاسفہ نے بھی تغائر علمی (یعنی ذہنی) اور اتحاد خارجی کہا ہے۔

تشریح:

یعنی خارج میں متحد ہے اور ذہن میں متغیر ہے اور ہر چیز کی تبدیلی ہے۔ یعنی صفات علمی طور پہ سمجھ لیا ہے اور اعتبارات کے طور پہ سمجھ لیا ہے۔

متن:

اور یہ نہیں کہا کہ علم کا مفہوم عین مفہوم ذات تعالیٰ و تقدس ہے یا عین مفہوم قدرت و ارادہ ہے، بلکہ عینیت وجود خارجی کے اعتبار سے کہا ہے۔ لہذا جب تک یہ (صوفیہ) وجود خارجی کے تغایر کا اعتبار نہ کریں صفات کے انکار کرنے والوں میں سے نہیں نکلتے، کیونکہ تغائر اعتباری کچھ نفع نہیں دیتا، "كَمَا عَرَفْتَ" جیسا کہ آپ نے سمجھ لیا۔

عقیدہ (7): اور حق تعالیٰ قدیم اور ازلی ہے اور اس کے سوا کسی کے لئے "قدم و ازل" ثابت نہیں، تمام ملتوں کا اس پر اجماع ہے اور جو شخص بھی حق جل و علا کے سوا کسی غیر کے قدم و ازلیت کا قائل ہوا اس کی تکفیر کی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے ابن سینا اور فارابی اور ان جیسے عقائد والوں کی تکفیر کی ہے جو عقول و نفوس کے قدم کے قائل ہیں۔

تشریح:

یعنی وہ عقل کے بھی قائل ہیں۔

متن:

اور ہیولیٰ اور صورت کے قدیم ہونے کا گمان رکھتے ہیں اور آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کو بھی قدیم جانا ہے۔

تشریح:

در اصل اس وقت عقل فلسفہ ہی تھی تو جنہوں نے عقل کو مانا انہوں نے فلسفہ کو مانا اور جنہوں نے فلسفہ کو مانا تو انہوں نے فلسفیوں کو بھی مانا اور جنہوں نے فلسفیوں کو مانا انہوں نے ان کی غلط چیزوں کو بھی مانا۔ لہذا انہوں نے یہ ساری چیزیں کی تھیں، جیسے آج کل جو لوگ سائنس سے مغلوب ہوتے ہیں وہ سائنس کی ہر بات مانتے ہیں، چاہے سائنس کی وہ بات ابھی تک ثابت نہ ہوئی ہو، صرف ایک تھیوری ہو، جیسے ڈارون تھیوری ہے۔ حالانکہ یہ تھیوری ہے کوئی قانون نہیں ہے، لیکن وہ اس پر بڑا یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ جیسے اس وقت لوگ فلسفے سے متاثر تھے اس طرح آج کل اس قسم کے لوگ سائنس سے متاثر ہیں۔

متن:

اور ہمارے خواجہ حضرت (باقی باللہ) قدس سرہ فرماتے تھے کہ "شیخ محی الدین بن العربی رحمۃ اللہ علیہ کاملین کی ارواح کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔" اس بات کو ظاہر کی طرف سے پھیر کر تاویل پر محمول کرنا چاہیے تاکہ اہل ملت کے اجماع کے مخالف نہ ہو۔

عقیدہ (8): اور حق تعالیٰ قادر مختار ہے، ایجاب کی آمیزش اور اضطرار کے گمان سے منزہ اور مبرا ہے۔

تشریح:

یہ بھی حضرت نے فلسفہ پر رد کیا ہے کیونکہ اس وقت فلسفی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عقلِ اول کو پیدا کیا اور فارغ ہو گیا۔ "نَعُوذُ بِاللہِ مِنْ ذَالِکَ" اور وہ بھی اضطراری طور پر، یعنی ارادے کے طور پر نہیں بلکہ اضطراری طور پر عقلِ اول کو پیدا کیا۔ اور ایجاب کی آمیزش کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز اللہ پہ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ پاک قادر و مختار ہے۔

متن:

بے عقل فلاسفہ نے کمال کو ایجاب میں جان کر واجب تعالیٰ سے اختیار کی نفی کر کے اس کے ایجاب کا اثبات کیا ہے۔

تشریح:

واجب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے سے certain ہے کہ یہ چیز ایسے ہونی ہے اور اللہ کو بھی یہی کرنا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا، اس طرح اللہ پاک کو مضطر کر دیا، اللہ تعالیٰ کو پابند کر دیا گویا اللہ تعالیٰ کی قدرت والی بات رہی ہی نہیں اور اختیار والی بات رہی ہی نہیں۔ اس طرح تو قرآن پاک کی اس آیت: ﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (البقرۃ: 20) کی بھی نفی ہو گئی اور قرآن پاک کی کسی ایک آیت کا انکار کفر ہے۔ لہذا یہ باتیں وہاں تک جاتی ہیں، لہذا حضرت کو غصہ تو آنا ہے۔

متن:

اور ان بے عقلوں نے ذات واجب تعالیٰ و تقدس کو بیکار سمجھا ہے اور سوائے ایک مصنوع کے کہ وہ بھی ایجاب سے ہے زمین و آسمان کے خالق سے صادر نہ جان کر حوادث

کے وجود کو عقل فعال کی نسبت دی ہے۔

تشریح:

یعنی ان کی عقلِ اول نے عقلِ دوم بنائی، آسمان اول بنا دیا، پھر عقلِ دوم نے عقلِ سوم بنا دی۔ آسمان ثانی بنا دیا۔ کیا عجیب فضول بکواسات ہیں۔ یہ کہاں سے ثابت ہے؟ کیا کر رہے ہو؟ سارے مفروضے ہیں، مفروضوں کی بنیاد پر ایمان کو خراب کر رہے ہیں۔ اخیر میں عقلِ فعال آتی ہے جو یہ سارے کام کرتی ہے۔ تو حضرت فرماتے ہیں

متن:

حوادث کے وجود کو عقل فعال کی نسبت دی ہے جس کا وجود ان کے وہم کے علاوہ کہیں ثابت نہیں ہے۔ اور ان کے فاسد زعم میں حق سبحانہ و تعالیٰ سے ان کو کچھ کام نہیں ہے۔ لازمی طور پر چاہیے تھا کہ اضطراب و اضطرار کے وقت اپنی عقل فعال کی طرف التجا کرتے۔

تشریح:

یعنی کبھی مصیبت پیش آئے تو عقلِ فعال سے مانگتے کہ اے عقلِ فعال یہ کر دو۔

متن:

اور حضرت حق سبحانہ کی طرف رجوع نہ کرتے کیونکہ ان کے نزدیک حوادث کے وجود میں اس تعالیٰ کی کوئی مداخلت نہیں ہے۔

تشریح:

حضرت فرماتے ہیں کہ مشرکین بھی اس طرح نہیں کرتے تھے، مشرکین کا بھی یہ حال تھا کہ جیسے عکرمہ رضی اللہ عنہ کا جو ایمان لانے کا واقعہ ہے کہ وہ کشتی میں حبشہ میں جا رہے تھے تو طوفان آ گیا اور طوفان ایسا آیا کہ جیسے وہ ڈوبنے کے قریب ہو گئے ہوں، سب لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے لگے کہ اے اللہ ہمیں بچا لے۔ عکرمہ نے کہا کہ عُزّٰی اور لَات سے کیوں نہیں مانگتے ہو؟ انہوں نے کہا اس موقع پر وہ کچھ نہیں کر سکتے، تو عکرمہ نے کہا کہ کشتی واپس موڑو، یہ کیا بات ہوئی کہ خشکی پر بھی مسلمانوں نے ہمارا بھرکس نکالا، لات و عزی ہماری کوئی مدد نہ کر سکے۔ اور سمندر میں بھی وہ کچھ نہیں کر سکتے تو وہ

کس مرض کی دوا ہیں۔ چونکہ سردار تھے تو وہ کشتی واپس ہو گئی اور وہ واپس آ گئے۔ راستے میں بیوی بھی ملی اور آ کر مسلمان ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین بھی اخیر میں اللہ پاک کو ہی پکارتے تھے، کیونکہ وہ اللہ پاک کو قادرِ مطلق مانتے تھے۔

متن:

اور کہتے ہیں کہ عقل فعال ہی حوادث کی ایجاد سے تعلق رکھتی ہے بلکہ وہ تو عقل فعال سے بھی رجوع نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک بلیات کے دفع کرنے میں بھی ان کا اختیار نہیں ہے۔ یہ بدنصیب (فلاسفہ) اپنی بے وقوفی اور حمایت میں فرقہ ضالّہ سے بھی آگے بڑھ گئے حالانکہ کافر بھی بخلاف ان بدبختوں کے حق سبحانہ و تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں اور بلاؤں کے دفعیہ کو اسی تعالیٰ سے طلب کرتے ہیں۔ تمام گمراہ اور بے دین فرقوں کی نسبت ان بدبختوں میں دو چیزیں زیادہ ہیں ایک یہ کہ احکام منزلہ کا کفر اور انکار کرتے ہیں اور اخبار مرسلہ کے ساتھ عداوت و دشمنی رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ اپنے بیہودہ اور واہی مطالب اور مقاصد کے ثابت کرنے میں بیہودہ مقدمات کو ترتیب دیتے اور جھوٹے دلائل اور باطل شواہد کو عمل میں لاتے ہیں، اپنے مطالب و مقاصد کے ثابت کرنے میں جس قدر ان کو خبط لاحق ہوا ہے اور کسی بے وقوف کو اس قدر لاحق نہیں ہوا۔

تشریح:

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو عالم سمجھتے ہیں، یعنی دوسرے لوگوں کی گمراہی جہل کی وجہ سے ہوتی ہے اور ان کی گمراہی علم کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لئے ان کو واپس آنے کی توفیق نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اپنے آپ کو سب سے بڑا عالم سمجھتے ہیں حتی کہ پیغمبروں سے بھی زیادہ عالم سمجھتے ہیں اس لئے ان کو کون سمجھائے۔ جبکہ دوسرے لوگ بیچارے سمجھتے ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں آتا تو کبھی ان کو سمجھ آ جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہم لوگ غلطی پر ہیں۔

متن:

آسمان اور ستارے جو ہر وقت بے قرار اور سرگرداں ہیں اپنے کاموں کا مدار ان کی حرکات اور اوضاع پر رکھا ہے، اور آسمانوں کے خالق اور ستاروں کے موجد و محرک اور

مدبر (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

تشریح:

جب میں رویتِ ہلال کمیٹی کا رکن تھا تو چونکہ وزارتِ مذہبی امور میں آنا جانا لگا رہتا تھا، وزارتِ مذہبی امور کے سیکریٹری نے میری طرف ایک بھیج دی جس میں یہ بات تھی کہ قاضی منجم صاحب نے پرویز مشرف کو درخواست دی تھی کہ پاکستان کا جھنڈا منحوس ہے کیونکہ اس پر جو چاند ہے وہ ڈوبتا چاند ہے، اس کو بدلنا چاہیے، تو مشرف نے وزارتِ مذہبی امور کو بھیج دی، انہوں نے میری طرف بھیج دی، معاملہ بڑا نازک تھا اور جواب بھی دینا تھا، میں نے سوچا کہ اگر میں براہِ راست قرآن و حدیث کی بات کرتا ہوں تو کہیں وہ اس کی توہین نہ کریں کیوں کہ ان بے چاروں کے بارے میں ہمیں کیا پتا کہ یہ کیسے ہیں، لہٰذا پہلے عقلی دلائل اور پھر نقلی دلائل دینا زیادہ بہتر ہے۔ تو پہلے میں نے کہا کہ جس نے بھی یہ درخواست دی ہے وہ بڑا بے وقوف ہے کہ اس کو یہ بھی نہیں پتا نہیں کہ ڈوبتے ہوئے چاند اور چڑھتے ہوئے چاند میں کوئی فرق نہیں ہوتا، صرف direction کا فرق ہوتا ہے۔ اس لئے اگر آپ تصویر لیں تو دونوں کی حالتوں کی تصویر ایک جیسی ہو گی، کاغذ پر تو تصویر آتی ہے لہٰذا two dimensional اس میں تو فرق نہیں ہو گا لہٰذا یہ بے وقوف ہے کہ اس نے اس کو ڈوبتا چاند کہا ہے حالانکہ چاند ایک ہی ہوتا ہے۔ دوسری بات میں نے یہ کی کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا ہے:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبُوں

لہٰذا ستاروں کا علم رکھنے والوں کی باتوں کی کیا حیثیت ہے، علامہ اقبال بھی کہتا ہے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ تو اپنے حال سے بھی واقف نہیں ہیں، کسی اور کے بارے میں کیا خبر دیں گے۔ تو یوں دو باتیں ہو گئیں، ایک عقلی اور دوسری ان کے اعتبار سے نقلی۔ اور تیسرے نمبر پر میں نے یہ حدیث شریف بیان کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو نجومیوں کے قول پر یقین کرے 40 دن تک اس کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ میں نے یہ تین نکات لکھ کر ان کو بھیج دیئے، اَلْحَمْدُ لِلّٰہ سیکریٹری صاحب کو بات سمجھ میں

آگئی، انہوں نے کہا بس یہی بھیجتے ہیں، یہی جواب ہے۔ تو انہوں نے بھیج دیا، یوں پاکستان کا جھنڈا بچ گیا۔ ورنہ پتا نہیں پاکستان کے جھنڈے کے ساتھ کیا کرتے۔ نجومی لوگ اس قسم کی شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باجود پشاور والے ہمارے اوپر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم منجمین کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے تو نجومیوں کا ناطقہ بند کیا ہوا ہے، ہم منجمین کے ماننے والے نہیں ہیں۔

متن:

ان کے منظم اور منضبط یعنی مرتب کردہ علوم میں سے ایک علم ہندسہ ہے جو محض لا یعنی بیہودہ اور لا طائل ہے۔

تشریح:

ہندسے کے اعتبار سے بحث کرتے ہیں کہ اس کا یہ عدد ہے، اس کا یہ عدد ہے اور اس کا یہ عدد ہے، اس کو انہوں نے پورا علم بنایا ہوا ہے۔

متن:

بھلا مثلث کے تینوں زاویوں کا دو زاویہ قائمہ کے برابر ہونا کس کام آئے گا اور شکل عروسی اور مامونی جو ان کے نزدیک بڑی مشکل اور جانکاہ ہے کس غرض کے لئے ہے؟

تشریح:

یہ حضرت نے ان کی باتوں پر ردّ کیا ہے۔

متن:

علم طب و نجوم اور علم تہذیب اخلاق جو ان کے تمام علوم میں سے بہترین علوم ہیں، انہوں نے گزشتہ انبیاء علی نبینا و علیہم الصلوات و التسلیمات کی کتابوں سے چرا کر اپنے باطل اور بیہودہ علوم کو رائج کیا ہے، جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "اَلْمُنْقِذُ عَنِ الضَّلَالِ" میں اس امر کی تصریح کی ہے۔

تشریح:

جیسے جڑی بوٹیوں کی جو ابتدا ہوئی تھی تو کس کو پتا چل سکتا تھا کہ کس کی کیا خصوصیت ہے، لہذا پہلے بتا دیا گیا تھا، جس کے بعد ان لوگوں نے وہ لیں اور ان کے ذریعے تجربات

کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس سے پھر ایک علم بننا شروع ہو گیا۔

متن:

اہل ملت اور انبیاء علیہم الصلوۃ و السلام کے متبعین اگر دلائل و براہین میں غلطی کریں تو کچھ ڈر نہیں کیونکہ ان کے کام کا مدار انبیاء علیہم الصلواۃ و السلام کی تقلید پر ہے اور اپنے مطالب عالیہ کے ثبوت کے لئے دلائل و براہین کو صرف بطور تبرع (بطور احسان) لاتے ہیں۔ یہی تقلید ان کے لئے کافی ہے، بخلاف ان بدبختوں کے جو تقلید سے نکل کر صرف دلائل کے ساتھ اپنے مطالب کو ثابت کرنے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، "ضَلُّوا فَأَضَلُّوا" "یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا"۔

تشریح:

کیونکہ ایک ہوتا ہے عقلی دلائل کو شریعت کے سمجھنے میں استعمال کرنا اور ایک ہے شریعت کے خلاف عقل کے دلائل کو استعمال کرنا کہ شریعت کچھ بھی نہیں، دونوں میں کتنا فرق ہے۔ چنانچہ فقہاء شریعت کو ثابت کرنے میں عقلی دلائل استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی کہہ دے کہ حدیث شریف اس وقت ملی ہی نہیں تھی، تو یہ ایک عقلی دلیل ہے کیونکہ جب وہ زندہ نہیں تھا تو مروی کیسے ہے؟ لہذا کہیں گے کہ درایت کے لحاظ سے ختم ہو گیا۔ چنانچہ فقہاء عقلی دلائل کو شریعت کے سمجھنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں، اس کی مخالفت میں نہیں کر رہے ہیں۔

متن:

حضرت عیسی علی نبینا و علیہ الصلوۃ والسلام کی نبوت کی دعوت جب افلاطون کو پہنچی جو ان بدنصیبوں کا سب سے بڑا سردار ہے تو اس نے کہا: "نَحْنُ قَوْمٌ مُّهْتَدُوْنَ لَا حَاجَةَ بِنَا اِلٰى مَنْ يَهْدِيْنَا" "ہم ہدایت یافتہ قوم ہیں اور ہم کو ایسے شخص کی حاجت نہیں ہے جو ہم کو ہدایت دے"۔ اس بے وقوف کو چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو جو مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور مادر زاد اندھے کو بینا (دیکھنے والا) اور ابرص (جذامی کوڑھی) کو اچھا کر دیتا ہے، جو (ان کی) حکمت کے قانون سے نا ممکن ہے پہلے ان کو دیکھتا اور ان کے حالات دریافت کرتا (پھر جواب دیتا) بغیر دیکھے جواب دینا کمال درجہ دشمنی اور کمینہ پن ہے۔

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کل آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است
(فلسفہ اکثر سفہ (بے وقوفی) ہے، بس سفہ کل کا حکم آخر رہے اکثر کا حکم)

"نَجَّانَا اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ عَنْ ظُلُمَاتٍ مُّعْتَقِدَاتِهِمُ السُّوءِ" "اللہ سبحانہ ان کے برے عقائد کی تاریکی سے ہم کو نجات دے"۔ ان ہی ایام میں فرزندی محمد معصوم نے "جواہر شرح مواقف" کو پورا کیا ہے۔ اثنائے سبق میں ان بے وقوفوں (فلاسفہ) کی برائیاں واضح طور پر سامنے آئیں اور ان کی وجہ سے بہت فائدے مترتب ہوئے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ (الاعراف: 43) "تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہم کو ہدایت دی اگر وہ ہم کو ہدایت نہ دیتا تو ہم ہرگز ہدایت نہ پاتے، بیشک ہمارے رب کے رسول حق بات لیکر آئے"۔ اور شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی (بعض) عبارتیں بھی ایجاب کی طرف ناظر ہیں اور قدرت کے معنی میں فلسفہ کے ساتھ موافقت رکھتی ہیں کہ اس کے ترک کی صحت قادر (حق تعالیٰ) سے تجویز نہیں کرتے اور فعل کی جانب کو لازم جانتے ہیں۔

عجب معاملہ ہے کہ شیخ محی الدین (اللہ تعالیٰ کے) مقبولین میں سے نظر آتے ہیں لیکن ان کے اکثر علوم جو اہل حق کی آراء کے مخالف ہیں خطا اور نادرست ظاہر ہوتے ہیں شاید ان کو خطائے کشفی کے باعث معذور رکھا گیا ہے اور خطائے اجتہادی کی طرح ان سے ملامت دور کر دی گئی ہے۔ شیخ محی الدین کے حق میں فقیر کا اعتقاد یہی ہے کہ ان کو مقبولین میں سے جانتا ہے اور ان کے ان علوم کو (جو اہل حق کے) مخالف ہیں خطا اور ضرر رساں دیکھتا ہے۔ اس گروہ (صوفیہ) کے بعض لوگ ایسے ہیں کہ شیخ (موصوف) کو طعن و ملامت بھی کرتے ہیں اور ان کے علومِ مخالفہ کو بھی غلط اور نا درست سمجھتے ہیں۔ اور اس گروہ کے بعض لوگ شیخ (موصوف) کی تقلید اختیار کر کے ان کے تمام علوم کو درست جانتے ہیں اور دلائل و شواہد سے ان علوم کی حقیقت کو ثابت کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ہر دو فریق نے افراط و تفریط کا راستہ اختیار کیا ہے اور میانہ روی سے دور ہو گئے ہیں، شیخ (موصوف) کو جو کہ اولیائے مقبولین میں سے ہیں خطائے کشفی کے باعث کس طرح رد کر دیا جائے۔

تشریح:

میں کہتا ہوں کہ خطائے کشفی کوئی ایسی بعید بات نہیں ہے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فاتحہ خلفُ الاِمام کو فرض جانتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو حرام جانتے ہیں اب حرام اور فرض میں کتنا فرق ہے، لیکن دونوں حضرات مقبولین ہیں، دونوں اولیا اللہ ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔

متن:

اور ان کے علوم کو جو کہ صحت و صواب سے دور ہیں اور اہل حق کی رائے کے مخالف ہیں تقلید کی وجہ سے کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے: "فَالْحَقُّ هُوَ التَّوَسُّطُ الَّذِی وَفَّقَنِیَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ بِمَنِّهٖ وَكَرَمِهٖ" "پس حق اسی میانہ روی میں ہے جس کی توفیق اللہ سبحانہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے بخشی ہے"۔

ہاں مسئلہ "وحدت الوجود" میں اس گروہ (صوفیہ) کی ایک بڑی جماعت شیخ کے ساتھ شریک ہے اگرچہ شیخ (موصوف) اس مسئلہ میں بھی ایک خاص طرز رکھتے ہیں لیکن اصل بات میں وہ سب لوگ (شیخ کے ساتھ) شریک ہیں۔ یہ مسئلہ بھی اگرچہ ظاہر میں اہل حق کے عقائد کے مخالف ہے لیکن توجہ کے قابل اور تطبیق دینے کے لائق ہے۔ اس فقیر نے اللہ سبحانہ کی عنایت سے ہمارے حضرت (خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی "شرح رباعیات" کی شرح میں اس مسئلہ کو اہل حق کے عقائد کے ساتھ تطبیق دی ہے اور فریقین کے نزاع کو لفظ کی طرف پھیرا ہے (یعنی نزاع لفظی ثابت کیا ہے) اور طرفین کے شکوک و شبہات کو اس طرح حل کیا ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی: "كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى النَّاظِرِ فِيْهِ" "جیسا کہ اس کے دیکھنے والے پر پوشیدہ نہیں ہے"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰه آٹھ عقائد کی تشریح ہو گئی ہے۔ اللہ جل شانہ ہم سب کے عقائد کو صحیح فرمائے اور اسی کے اوپر ہی پوری زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ ۝

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے ان کے صاحبزادے حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کتاب "مقاماتِ قطبیہ اور مقالاتِ قدسیہ" کے نام سے لکھی ہے اس کی تعلیم جاری ہے یہ تعلیم ہم کیوں کرا رہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بزرگوں نے تو ساری عمر اس کام میں لگائی ہوتی ہے کہ ہم کیسے اللہ تعالیٰ کے بن جائیں اور بڑی ریاضتیں اور مشقتیں کی ہوتی ہیں۔ چونکہ جو کام انہوں نے کئے ہوتے ہیں، مختلف تجربات سے گزرے ہوتے ہیں، پھر ان کو مشاہدات حاصل ہو چکے ہوتے ہیں لہذا جب وہ کسی کام کے بارے میں گفتگو فرماتے ہیں تو اس سے برسوں کا راستہ قطع ہونے کی امید ہوتی ہے کیونکہ دوسروں کے تجربات سے سیکھنا عقل مندی ہے اور خود اپنے آپ کو تجربہ گاہ بنانا بے وقوفی ہے، انسان خود جب یہ کام کرتا ہے تو بعض مواقع پر کامیابیاں حاصل کرتا ہے اور کئی مقامات پر ناکامی سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، لیکن جب انسان دوسرے تجربہ کار حضرات کی باتیں سنتا ہے تو گویا کامیابی کی کنجیاں اس کے ہاتھ آ جاتی ہیں اور وہ بہت آسانی کے ساتھ منازل طے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کی کتابوں میں ایسی باتیں مل جاتی ہیں جو بہت کام آتی ہیں۔

یک ساعت در صحبت با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

زندگی میں اگر کوئی کسی بزرگ کے ساتھ بیٹھتا ہے تو وہ بیٹھنا اس کو سینکڑوں سالوں کی اطاعت سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے کیونکہ ان بزرگ کو جو گُر حاصل ہو چکے ہوتے ہیں وہ اس کو مفت میں ملتے رہتے ہیں اور بڑا فائدہ ہوتا ہے اور یہ بات تو طے شدہ ہے کہ بزرگوں کے ملفوظات ان کی صحبت کے قائم مقام ہوتے ہیں، گویا بزرگوں کے ملفوظات ان کی صحبت کا نچوڑ ہوتے ہیں، جب یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے تو پھر امید کرنی چاہیے کہ بزرگوں کی کتابیں پڑھنے اور ملفوظات پڑھنے سے ان کی صحبت کا اثر حاصل ہو سکتا ہے

اور جب ان کی صحبت کا اثر حاصل ہو سکتا ہے تو گویا صحبت سے جو فائدہ حاصل ہو رہا تھا اس کا کچھ حصہ اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اب ایک اور بات بھی سن لیجئے کہ مثلاً میں آج کل کے دور کے کسی بزرگ کی صحبت اٹھاتا ہوں تو وہ آج کل کا بزرگ ہے جس کا فائدہ اسی حساب سے ہو گا اور اگر گزشتہ کسی بزرگ کی صحبت اٹھاتا ہوں تو اس کا فائدہ اس کے حساب سے ہو گا، اس لئے گزشتہ دور کے وہ بزرگ جن کو اللہ پاک کا اس درجے کا تعلق حاصل ہوتا ہے ان کی کتابیں پڑھنے سے اگر سمجھ میں آ جائیں تو یہ بہت بڑی نعمت ہے، یعنی سمجھ آنا بھی ضروری ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ میں آنا ذرا مشکل ہوتا جاتا ہے تاہم اگر سمجھ میں آ جائیں تو یہ بہت بڑی نعمت ہوتی ہے جس کے ذریعے سے ہم اپنی زندگیوں کو سنوار سکتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے ہمارے سلسلہ میں اس چیز کا بڑا خیال رکھا گیا ہے کہ بزرگوں کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کا اہتمام ہے۔ مثنوی شریف کی تعلیم بھی اسی کی کڑی ہے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کی تعلیم بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے اور حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس کتاب کی یہ تعلیم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور زمانہ ملفوظات شریف کی جلد انفاسِ عیسیٰ کی تعلیم تقریباً بارہ سال میں مکمل کر چکے ہیں۔ اور اب ماشاء اللہ اس کے پاور پوائنٹ بن چکے ہیں اور مختلف جگہوں پہ اس کا درس شروع ہے۔ لہذا ہمارا تو طریقہ یہی ہے کہ ہم لوگوں کو بزرگوں کی باتیں سناتے ہیں اور جس طرح ہمیں اس سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ در اصل یہ ایک غلط فہمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے مجھے کچھ بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ مثلاً خوارج کو ایک غلط فہمی ہوئی تھی، وہ کہتے تھے کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے کسی اور چیز کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت سے بہت دور جا پڑے، انہوں نے قرآن کی وہی تشریحات کیں جو ان کے نفس نے کیں، نتیجتاً نفس کے مارے اتنے سخت ہو گئے کہ وہ لوگوں کے لئے بھی مصیبت بن گئے اور اپنے لئے بھی مصیبت بن گئے اور ہدایت سے بہت دور جا پڑے۔ اس کے بر عکس جنہوں نے رجال اللہ کو لے لیا لیکن قرآن کو چھوڑ دیا وہ بھی بہت زیادہ گمراہی کا شکار ہو گئے اور وہ رجال اللہ تک بھی نہیں پہنچے۔ نتیجتاً دونوں محروم رہے۔ لیکن اگر رجال اللہ اور کتاب اللہ دونوں کے ساتھ

کسی نے تمسک کیا تو وہ الحمد للہ کامیاب و کامران ہوئے اور یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے، ہمارے سلسلہ میں بھی یہی دونوں چیزیں ہیں کہ رجال اللہ کے ساتھ بھی تعلق ہے اور کتاب اللہ کے ساتھ بھی تعلق ہے۔ الحمد للہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اسی میں ہدایت ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرما دے۔

بہر حال حضرت نے ایک شعر پڑھا تھا جو غالباً یہاں لکھا ہے، میرے خیال میں پہلے یہیں سے شروع کرتے ہیں اگرچہ اس کا کچھ حصہ پہلے ہو چکا ہے لیکن ربط کے لئے ضروری ہے کہ کسی پرانی جگہ سے ہم شروع کریں۔

متن:

تا خاطرت مخسر طبع و ہوا بود
جانت اسیر رنج و بلا مبتلا بود
ہرگز بسوئے صحبت بیگانہ نہ کند التفات
ہر کس کہ دریں منزل و رہ آشنا بود
بر طبع و نفس پابنہ ار خواہی اے عزیز
تا برسر تو سایۂ لطف خدا بود
ایمن مباش خواجہ و نومید ہم مشو
کاسلام درمیان خوف و رجا بود
زلنا و بر بقا مکن اے خواجہ اعتماد
از بہر آنکہ عاقبت او فنا بود
در پنج روز عمر کہ بر شارع فناست
آن کن کہ در طریق شریعت روا بود

از خوف جانِ من بلب رسید ائے عزیز
تا بازگشت من بقیامت کجا بود

ترجمہ: جب تک تمہارا دل خواہش اور لالچ رکھتا ہو، تو تمہاری روح رنج اور مصیبت میں گرفتار ہو گی۔

تشریح:

روح کا مقصود اللہ ہے اور نفس کا مقصود خواہشات کو پورا کرنا ہے لہٰذا جو نفس کے پیچھے چلا جا رہا ہے وہ روح کو مصیبت میں گرفتار کر رہا ہے، لیکن یہاں بھی ایک اعتدال رکھنا ہوتا ہے جو یہ ہے کہ نفس کی کچھ ضروریات ہیں اور نفس کی کچھ خواہشات ہیں، جو اس کی ضروریات ہیں ان سے مفر نہیں ہے اور جو خواہشات ہیں ان کی حد نہیں ہے۔ ان دونوں چیزوں کو ماننا پڑے گا یہ حقائق ہیں۔ نفس کی ضروریات کی مثال جیسے کھائے اتنا کہ انسان زندہ رہ سکے جو نفس کی ضرورت ہے یہ کرنا پڑتا ہے، ورنہ نفس سے روح کا رشتہ ہی ختم ہو جائے گا، انسان مر جائے گا۔ لہٰذا اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے اتنا کھانا پینا اس کی ضروریات میں سے ہے، اس بات کا شریعت نے بھی خیال رکھا ہے، ایسا خیال رکھا ہے کہ خدانخواستہ اگر نفس اور روح کا رشتہ منقطع ہونے کا احتمال ہو تو اس وقت بقدرِ ضرورت حرام سے بھی کھایا جا سکتا ہے بلکہ یہ کرنا لازم ہو جاتا ہے ورنہ اعمال ہی ختم ہو جائیں گے، لیکن جب تک وہ خطرہ نہ ہو تو اپنے آپ کو نفس کی خواہشات پوری کرنے سے بچانا اور ضروریات کو اس درجے میں لانا کہ جس کی اجازت ہے، ہر شخص کے لئے ضرورت ہے اور روح کے لئے ضرورت ہے ورنہ روح کمزور ہو جائے گی نفس غالب رہے گا اور روح کو مصیبت پڑے گی۔ اور چونکہ خواہشات کو پورا کرنے کی ہوس کا نام لالچ ہے تو جتنی لالچ زیادہ ہو گی اتنی روح مصیبت میں مبتلا ہو گی۔

متن:

جو شخص اس منزل اور راہ سے واقف ہو وہ بے گانوں کی محبت کی جانب التفات نہیں کرتا۔

تشریح:

یعنی جو اس راہ سے بے گانہ ہے وہ ان کی طرف نہیں جاتا۔

متن:

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے سر پر اللہ تعالیٰ کے لطف کا سایہ ہو، تو اپنی خواہش اور نفس کو پاؤں کے نیچے مسل دو۔

تشریح:

اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے زمین کے اوپر آپ جتنے زور سے چھلانگ لگائیں گے اتنا ہی آپ اوپر جائیں گے کہ جتنا انسان زمین کو زور سے دباتا ہے اتنا ہی اوپر جاتا ہے۔ اسی طرح اپنے نفس کو جتنا کوئی مسلتا ہے اور دباتا ہے اتنا ہی وہ روحانیت کا راستہ طے کرتا ہے۔

متن:

اے بھائی بے پرواہ اور امن میں نہ رہ،

تشریح:

در اصل بعض دفعہ الفاظ تھوڑے سے mix ہو جاتے ہیں جس وجہ سے پریشانی ہو جاتی ہے۔ بے پروا اور امن کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی عاقبت سے بے پروا ہو تو بظاہر اسے امن ہے اور مطمئن ہے، لگ رہا ہے کہ یہ تو بڑے مزے سے بیٹھا ہوا ہے، لیکن اگر وہ اس کا خیال نہیں رکھے گا تو یہی امن اور بے پروائی اس کو مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ مثلاً ایک ایسا شخص ہے جس کی نظر بہت کم ہے اور ساتھ ہی سانپ ہے، نظر کے کم ہونے کی وجہ سے وہ بڑا اطمینان میں ہے لیکن اس کو کیا پتا ہو گا کہ سانپ میرے قریب آ گیا ہے، اب اگر کوئی اس کو اس کے نمبر کی عینک لگا دے اور وہ دیکھ لے کہ میرے پاس تو اتنا بڑا اور خطرناک سانپ ہے تو یکدم پریشانی میں اچھلے گا، پریشان ہو گا، لوگ کہیں گے کمال ہے آرام سے بیٹھا تھا آپ نے اس کو خواہ مخواہ بے چین کر دیا۔ لیکن عقل مند کہے گا کہ یہی بے اطمینانی اور پریشانی اس کے بچنے کا ذریعہ ہے۔ ورنہ اگر یہ مطمئن رہتا اور پریشان نہ ہوتا تو اس سانپ نے اس کو ڈس لیا ہوتا۔ یہ ساری مثالیں ہیں کیونکہ ہم exact بات تو کر نہیں سکتے مثالوں سے ہی سمجھایا جا سکتا ہے۔

متن:

اے برادر اس بقا اور زندگی پر اعتماد نہ کر کیونکہ اس کا انجام فنا ہوتا ہے۔

تشریح:

یعنی اس کے ساتھ آپ اطمینان کا معاملہ نہ کریں کیونکہ اس کا انجام فنا ہے۔

متن:

اس پانچ دن کی زندگی میں جو کہ فنا کے راستے پر ہے، وہی کچھ کر جو کہ شریعت میں جائز ہو، مارے خوف کے میری روح میرے ہونٹوں تک آ گئی ہے کہ قیامت کے دن میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔

تشریح:

واقعتاً جس کو اس بات کا خیال ہو کہ قیامت کے دن میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا اَصْحَابَ الْیَمِیْنِ میں ہو گا یا أَصْحَابَ الْیَسَارِ میں، تو وہ کس طرح مطمئن ہو سکتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ جب انسان کھلکھلا کے ہنستا ہے تو فرشتے حیرت کرتے ہیں کہ کیا تجھے جنت میں اپنے مقام کا پتا چل گیا ہے؟ اس لئے تو اس طرح ہنس رہا ہے؟ واقعتاً یہ بات صحیح ہے، ہمیں تو پتا نہیں ہے، جیسے ایک انسان کو پھانسی دی جا رہی ہو اور وہ کھلکھلا کے ہنس رہا ہو تو عقل مند حیران ہو گا کہ شاید اس کو پتا نہیں ہے کہ اس کو پھانسی لگنے والی ہے۔

متن:

الغرض اے میرے پیارے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو عبادت کرتے ہوں گے، اور وہ طاعت اُن کے حق میں معصیت ہو گی۔ اور طالب مولیٰ کے بہت سے گناہ عبادت سے بہتر ہوں گے۔ اور یہ معنی اہل دلِ حضرات کے نزدیک مسلمہ بات ہے کہ ہر عبادت جو تیرے فخر و غرور کا سبب ہو وہ عبادت عین معصیت ہے۔

تشریح:

کیونکہ آپ کو کتنے گہرے گھڑے میں گرا رہا ہے۔ یعنی جس عبادت پر تو فخر کرے اور ناز کرے۔ میرے خیال میں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے شیطان ہی کو دیکھ لیں،

شیطان کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا اس نے عبادت نہیں کی تھی؟ عبادت کی تھی، اطاعت بھی کی تھی، علم بھی حاصل تھا، سب کچھ تھا، لیکن صرف اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل نہیں تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے نفس کو سامنے رکھا اور اللہ کے حکم کو سامنے نہیں رکھا۔

متن:

اور جو معصیت جس کا تو اعتراف اور عذر کرے حقیقت میں وہ معصیت تیرے لئے اطاعت سے زیادہ مفید ہے۔ یعنی اے میرے پیارے، جب تمہیں آثار اور حالات امن میں نظر آئیں، اور اعمال اخلاق بشری کے سبب درندوں اور شیاطین کی مانند محسوس ہوں، تو ان اعمال و آثار وغیرہ کو اچھی طرح غور و فکر اور سوچ بچار سے دیکھو، تاکہ تجھے معلوم ہو کہ اکثر عبادتیں اور طاعات جو کہ عام لوگ اور زمانے کے شیوخ رسم و رواج کے طور پر کرتے ہیں، یہ تمام بے سعادتی کی نشانیاں ہیں۔ اگرچہ ان کی شکل و صورت دینی ہوتی ہے۔ پس اگر ان سب کو عدل کے میزان میں رکھا جائے، تو اس کے حق میں یہ آیت مبارک نازل ہوئی ہے ﴿وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ (الزمر:47) اور ان پر خدا کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائے گا، جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا"۔ یعنی ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قیامت کے میدان میں جو کچھ ان کے خیال میں اچھا معلوم ہوتا تھا، وہ خلاف توقع برا معلوم ہو جائے گا۔ صحابۂ کرام نے جب رسول اللہ ﷺ سے اس کی تفسیر اور اس کا معنی پوچھا تو جناب سید المرسلین ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ بعض لوگ اپنے عمل و کردار کو طاعت اور عبادت خیال کرتے ہوں گے۔ جب قیامت کے دن دیکھیں گے تو جو کچھ انہوں نے طاعت تصور کیا تھا، وہ تمام کا تمام معصیت اور گناہ ہو گا۔ پس اے میرے پیارے یہ بہت مشکل کام ہے۔ زاہدوں نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی ہے کہ ٹوپی سر پر رکھنے اور چند رکعت نماز جو کہ عادت کے طور پر ہیں اور عبادت اور سلوک کی چند حکایتیں یاد کرنے سے کہ یہ سب کچھ بے سعادتی اور ذلت ہے، اسی کو کام خیال کر لیا جائے۔ ان تمام عبادت عادتی سے کچھ فائدہ بر آمد نہیں ہو گا۔ اے میرے پیارے اس زمانے کے شیوخ و عالموں کو چاہیے کہ ایسے پیر و مرشد کا دامن ارادت پکڑیں جو اس راستے پر چلا ہو،

تشریح:

اب یہ بڑی چھوٹی سی بات نظر آتی ہے لیکن بہت بڑی بات ہے یہ بات میں بارہا عرض کر چکا ہوں لیکن چونکہ ہر مجلس نئی ہوتی ہے اس لئے بار بار سمجھانا ہوتا ہے کہ جو شخص بغیر پیر کے، بغیر مرشد کے عبادت کر رہا ہو تو اس کی نظر اپنے آپ پر جاتی ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ آدمی اپنی اچھائی کی طرف جائے گا اپنی برائی کی طرف نہیں جائے گا کیونکہ وہ ہر وقت اپنی نظروں میں اونچا ہو رہا ہے جبکہ آپ ﷺ نے اس حوالے سے دعا فرمائی ہے کہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِی فِیْ عَیْنِ صَغِیْراً" (مسند بزار، حدیث نمبر 4439) "اے اللہ! مجھے میری نظروں میں چھوٹا کر دے" لیکن یہ اپنی عبادت کی وجہ سے، اپنی چال ڈھال سے روز بروز اپنی نگاہوں میں اچھا ہو رہا ہے، کیوں اچھا ہو رہا ہے؟ کیونکہ اس کے پاس تولنے کا کوئی آلہ نہیں ہے، اس کو کوئی سمجھانے والا نہیں ہے، وہ اس کا دوسرا رخ دیکھ ہی نہیں پا رہا، جو خود اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا کوئی اور ہی اس کو دیکھ سکتا ہے، تو چونکہ وہ اس کو دیکھ ہی نہیں رہا نتیجتاً عمل کے بارے میں آدمی کہتا ہے کہ بس میں تو ایسا ہوں۔ اور اچھی باتیں جو کتابوں میں لکھی ہیں نفس کے مارے وہ سب اپنے اوپر منطبق کر رہا ہے کہ مجھے یہ بھی حاصل ہو گیا، مجھے یہ بھی حاصل ہو گیا، مجھے یہ بھی حاصل ہو گیا۔ ان چیزوں کو اپنے اوپر منطبق کر رہا ہے اور بری باتوں کو دوسروں پہ منطبق کر رہا ہے کہ فلاں بھی برا ہے، فلاں بھی برا ہے، فلاں بھی برا ہے، ایسے ہی ہوتا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ پیر نہیں ہے، مرشد نہیں ہے۔ اگر کوئی مرشد ہوتا تو وہ اسے اسی جگہ پہ پکڑ لیتا ہے اور اس کو حال بتاتا ہے کہ تو اس میں بھی برا ہے، اس میں بھی برا ہے، اس میں بھی برا ہے کیونکہ اس کو وہ چیز نظر آتی ہے۔ ابتدا میں تو یہ چیز کافی مشکل محسوس ہوتی ہے کہ پیر اس کو بار بار پکڑ رہا ہے کہ یہ بھی برا ہے، یہ بھی برا ہے، یہ بھی برا ہے، لیکن بعد میں جب اس کو اس کی برکت سے ادراک ہونے لگتا ہے تو جو بھی خوبی اس کو ملتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ میرے پیر کی برکت سے ہے، میرے سلسلہ کی وجہ سے ہے، میرے شیخ کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ اس وقت اس کو اس کی وہ نسبت یاد آنے لگتی ہے، لہٰذا وہ اپنے آپ سے نفور اور پیر کی متابعت کی طرف جاتا ہے، نتیجتاً اس کے ذہن میں، قلب میں یہ بات نہیں آتی کہ میں نے یہ

کیا، میں نے یہ کیا۔ وہ کہتا ہے اللہ کے فضل و کرم سے، سلسلہ کی برکت سے، مرشد کے طریقے پہ چلنے کی وجہ سے اللہ نے مجھے اس کی توفیق دی۔ لیکن جس کی نظر اپنے آپ سے ہٹ جائے تو کیا وہ ترقی کر رہا ہے یا نہیں؟ تو میں کہتا ہوں کہ مرشد کے پیچھے چلنے سے اگر یہ چیز حاصل ہوتی ہے تو اس کا بدل کوئی نہیں ہے یہ عادتاً کسی اور طریقے سے مل ہی نہیں سکتی، ہاں اللہ تعالیٰ جیسے خرقِ عادت کے طور پر بغیر عادت کے کوئی کام کراتا ہے تو اگر کسی کے ساتھ اس طرح ہو جائے تو وہ ایک الگ بات ہے، لیکن اس قسم کا معاملہ عام لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی شخص کو اچانک اربوں روپے کا خزانہ مل جائے تو کیا خیال ہے سارے لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں کہ ہمیں بھی خزانہ مل جائے گا، ایسا نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح کے واقعات جو کبھی کبھی ہوتے ہیں سب لوگ جانتے ہیں کہ ایسا سب کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میں اس کے لئے ایک بڑی جاندار مثال دیتا ہوں اور وہ مثال ہمارے دور کی ہے، آج کل 2 قسم کے مضامین ہیں سائنس اور آرٹس۔ حکمران جتنے بھی ہوتے ہیں وہ آرٹس والے ہوتے ہیں، لیکن لوگ سائنس کو فوقیت دیتے ہیں اور سائنس پڑھنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اپنے بچوں کو بھی سائنس پڑھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ جب حکمران آرٹس میں جاتے ہیں تو پھر بچوں کو آرٹس کی طرف کیوں نہیں لے جاتے ہو؟ کیا وجہ ہے؟ وجہ یہ ہے کہ آرٹس والے جو حکمران ہوتے ہیں وہ آرٹس پڑھنے والوں میں سے بہت تھوڑے ہوتے ہیں 1 فیصد بھی نہیں ہوتے، 99 فیصد لوگ سڑکوں پر پھر رہے ہوتے ہیں، ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، سائنس والے اگرچہ حکمران تو نہیں ہوتے لیکن اکثر یا کم از کم 40، 50 فیصد بر سرِ روزگار ہوتے ہیں۔ اس لئے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ مجھے اتنی بڑی چیز حاصل ہو جائے گی لوگ یہ دیکھتے ہیں اکثر کو کیا چیز حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثری قاعدے پر لوگ زیادہ عمل کرتے ہیں، تو جب دنیا میں اکثری قاعدے پہ زیادہ عمل کرتے ہیں تو پھر اس کام میں بھی کہ وہ اکثری قاعدہ پہ عمل کیوں نہ کریں کہ بغیر شیخ کے جو لوگ کسی طریقے سے پہنچے ہیں وہ بہت تھوڑے ہیں اور شیخ کے ذریعے سے جو لوگ پہنچتے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً ہم ذرا سا غور سے دیکھیں کہ جتنے بزرگوں کو ہم بزرگ سمجھتے ہیں جن کے ذریعے سے ہماری زندگیاں تبدیل ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں کیا وہ کسی مرشد سے فیض یافتہ ہیں یا بغیر مرشد کے ہیں، گویا آپ

ٹیسٹ کر لیں کہ ان میں وہ لوگ زیادہ ہیں جو مرشد کے ذریعے سے اس مقام تک پہنچے ہیں یا وہ ہیں جو بغیر مرشد کے پہنچے ہیں، مجھے تو ایک بھی نظر نہیں آتا، اگر آپ کو نظر آتا ہے تو مجھے بتاؤ۔ مجھے تو جن سے بھی فائدہ ہوا ہے وہ سارے مرشد والے ہیں، جن کو میں بزرگ سمجھتا ہوں، جن کو میں اللہ والا سمجھتا ہوں وہ سارے مرشد والے ہیں۔ لہذا اب کیا کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے مجھے بھی مرشد کے پیچھے جانا چاہیے کیوں کہ پوری زندگی کا حاصل ہی یہی ہے۔ یہ بالکل حقائق ہیں جو میں بتا رہا ہوں، ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم کیوں اپنے آپ کو خراب کریں۔ اس لئے حضرت نے فرمایا کہ:

متن:

ایسے پیر و مرشد کا دامن ارادت پکڑیں جو اس راستے پر چلا ہو، اور شریعت کے منازل سے آگاہ ہو۔ اور اسرار و حقیقت کی شراب کا ساغر آشنا ہو۔

تشریح:

یعنی جو حقیقت سے آگاہ ہو۔ کیونکہ ایک ہے میں نماز پڑھتا ہوں یہ تو شریعت پہ چلنا ہے لیکن نماز ایسے پڑھتا ہوں جو قبولیت والی ہو، یہ اسرارِ حقیقت ہے، یعنی میری نماز ضائع نہ ہو یہ اسرارِ حقیقت ہے مثلاً میں خشوع کو اختیار کروں، عاجزی کو اختیار کروں، عبدیت کو اختیار کروں، یہ ساری باطنی چیزیں ہیں، ظاہری نہیں ہیں، لیکن نماز جو ظاہری چیز ہے وہ پوری کی پوری ان چیزوں کے اوپر منحصر ہے اگر یہ چیزیں نہیں ہیں تو نماز کی حقیقت ہی ختم ہو جائے گی۔ جیسے اللہ پاک فرماتے ہیں ﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ (طٰہٰ: 14) "نماز کو قائم کرو میری یاد کے لئے" اس لئے جو نماز ہمیں اللہ کی یاد نہ دلائے اس کی حقیقت ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ (العنکبوت: 45) "بے شک نماز منکرات اور برائی سے روکنے والی ہے اور اللہ کی یاد تو بڑی چیز ہے" اس لئے جو نماز آپ کو منکرات سے اور برائی سے نہ روکے کیا نماز کی حقیقت آپ کو حاصل ہے؟ کیوں حاصل نہیں ہے؟ کیونکہ اللہ کی ذات کا ذکر تو بہت بڑی چیز ہے اور وہ اس میں نہیں ہے۔ وہ حقیقت آپ کو اس وجہ سے نہیں مل رہی۔

متن:

تاکہ وہ نفسانی اور شیطانی اعمال دور کرے اور روحانی و رحمانی (کیا زبردست الفاظ ہیں) اعمال کے بارے میں تمہاری رہنمائی کرے۔ کیونکہ اے میرے پیارے بادشاہوں کی خدمت کے طریقے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے اسرار کے دقائق اس راہ پر چلنے والے رہ شناسوں کی رہنمائی کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

تشریح:

نازک مزاج شاھاں تاب سخن ندارد

یعنی بادشاہوں کے پاس بیٹھنے کے لئے جس حوصلے کی ضرورت ہے وہ آپ کو اس سے ملے گا جو بادشاہوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہو ورنہ بادشاہ تک رسائی ہو جائے گی اگلے دن قید خانے میں ہوں گے، کیونکہ بادشاہ کے مزاج کو نہیں جانتے ہوں گے، پتا نہیں کیا سے کیا کر لیں گے۔ اسی طرح ان حضرات کے بغیر کچھ نہیں ہوتا یعنی عبادت کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے کیونکہ اس کے لئے اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا بھی ضروری ہے، یہ کیسے جمع ہو گا، یہ تو وہی کر سکتا ہے جو پہلے کر چکا ہو، جس کو یہ چیز حاصل ہو چکی ہو۔ جیسے مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھیں، میں ان کی مثال اکثر اس لئے دیتا ہوں کہ چونکہ وہ زیادہ کھلی بات ہے اور اکثر لوگ اس کو پڑھ چکے ہوتے ہیں، ورنہ سارے اکابر ایک جیسے ہیں۔ حضرت اپنے بارے میں فرماتے ہیں خطا کار، نا بکار، سیاہ کار، پتا نہیں کیا کیا اپنے آپ کو کہتے ہیں۔ کیا حضرت ایسے تھے؟ کیا وہ جھوٹ بولتے تھے؟ کیا تصنع کرتے تھے؟ یہ ساری باتیں اگر نفی میں ہیں تو پھر وہ کیا چیز تھی؟ مقصد یہ ہے کہ اعمال کے لحاظ سے دیکھو کہ حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کیا معمول تھا، اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائے کچھ چیزیں حضرت نے ایسی واضح فرمائی ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ رمضان شریف کا عمرہ حج کے برابر ہے تو حضرت رمضان شریف میں گئے ہیں تو سحری سے پہلے مسجد عائشہ پہنچتے ہیں، وہیں سحری کر کے احرام باندھتے ہیں اور کمال کی بات یہ ہے کہ فجر کی نماز میں حرم میں پہنچ آتے ہیں اور اس کے بعد پھر عمرہ کرتے ہیں اور عمرہ کرنے

کے بعد پھر آرام کرتے ہیں اور یہ روزانہ کا معمول تھا، ایک عمرہ روزانہ کرتے، پورا مہینہ اس استقامت کے ساتھ گزارتے۔ حالانکہ سفر کیا ہوا ہوتا تھا، تھکاوٹ ہوتی تھی، دوسرے نوجوان ساتھی کہتے ہیں ہم ڈھیر ہو جاتے لیکن حضرت تراویح کے لئے کھڑے ہوتے اور نماز پڑھ رہے ہوتے، کوئی چیز تو تھی۔ اسی کو روحانیت کہتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو کیا سمجھ رہے ہیں خطا کار، نابکار، سیاہ کار۔ اب ان تمام چیزوں کو جمع کرنا کتنا آسان ہے؟ عمل ایسا ہو کہ اس پر لوگوں کو رشک آئے، واہ سبحان اللہ کیا بات ہے۔ لیکن اپنے آپ کو ایسا سمجھیں۔ یہی تو بات ہے، یہی تو ہم نے ان حضرات سے سیکھنا ہے کہ اعمال تو ایسے کریں کہ انسان اس سے اپنے آپ کو عاجز سمجھے لیکن وہ کر رہے ہوں اور ساتھ ساتھ اپنی نظروں میں گرتے بھی جائیں۔ یہ بات آسان نہیں ہے، لیکن ان حضرات کے ساتھ بیٹھ بیٹھ کر، ان حضرات کے ساتھ رہ رہ کر یہ چیز سمجھ میں آ جاتی ہے۔ پھر ان حضرات کی برکت سے انسان عمل بھی کرتا ہے، ان حضرات کی برکت سے اپنے آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتے، یہی وہ چیز ہے جو حاصل کرنی ہوتی ہے اور یہ کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی، کتابوں سے کہانیاں حاصل ہوتی ہیں، یہ چیز عملی طور پر کسی مرشد کے پاس رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ آدمی سمجھتا ہے کہ مجھے یہ حاصل ہے حالانکہ اس کو حاصل نہیں ہوتی اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ شاید مجھ میں وہ چیزیں آ گئیں لیکن اس میں وہ چیزیں نہیں آئی ہوتیں۔ دوسری طرف جب کوئی مرشد کے پاس ہوتا ہے تو اس کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ حاصل نہیں ہے، گویا یہ پہلی صورت کی ضد ہے۔ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو جب اجازت ملی تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ یہ کیا ہوا۔ دوسری طرف کچھ لوگ چند دن کے ذکر اذکار کرنے کے بعد اپنے آپ کو خلافت کا اہل سمجھنے لگتے ہیں۔ بالآخر کوئی مسئلہ تو ہے۔ بہرحال حضرت فرماتے ہیں:

متن:

پس اے میرے محبوب، جو کوئی بھی بادشاہ سے ملنے کی طلب کرے، تو جب تک وہ بادشاہ کے کسی مقرب کی حمایت حاصل نہ کرے۔ اپنی مراد نہیں پا سکتا۔

تشریح:

بلکہ بعض لوگوں کو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، کیوں کہ اکثر لوگ جنہوں نے اس چیز کو سمجھا نہیں ہوتا وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے لئے مجھے دوسرے کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ ہے، بس اللہ ہی مقصود ہے، میں درمیان میں کسی اور کو کیوں لاؤں؟ تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ اللہ واقعی ہر جگہ ہے، اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے اللہ کے علاوہ کوئی مقصود بھی نہیں ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن وہ کون سی چیز ہے جو اس میں ضروری ہے۔ ایک دفعہ ایک عرب ساتھی سے میری ملاقات ہو گئی اور تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ ملاقات رہی، ان کو تصوف کے بارے میں بڑی معلومات تھیں، چونکہ عرب تھے تو عربی کتابیں ان کے مطالعہ میں تھیں حضرت سلیمان دامانی امام غزالی اور پتا نہیں کس کس کی کتابیں انہوں نے پڑھی تھیں جن میں سے بعض کے نام بھی مجھے معلوم نہیں تھے، میں ان سے متاثر ہو رہا تھا کہ کیا مطالعہ ہے، میں عش عش کر رہا تھا اور ان کے مطالعہ کی وسعت اور عمق کو دیکھ کر بڑا متاثر ہو رہا تھا، لیکن آخر میں ایک عجیب بات کر گئے، مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اپنے اور اللہ کے درمیان کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً مجھ پر بات کھول دی، میں نے کہا حضرت یہاں تھوڑی سی تصحیح کی ضرورت ہے، کم از کم ایک کو درمیان میں ماننا پڑے گا، انہوں نے کہا کون؟ میں نے کہا حضور ﷺ۔ ان پر بھی یہ بات فوراً کھل گئی کہنے لگے ہاں یہ بات تو صحیح ہے، آپ ﷺ ہمارے اور اللہ کے درمیان یقیناً ہیں، پیغمبر ہیں ورنہ رسالت چٹکی میں ختم ہو جائے، کیونکہ اگر یہ نہیں مانیں گے تو پھر رسول کا کیا مطلب ہے۔ کہنے لگے بالکل صحیح بات کہی آپ نے۔ میں نے کہا پھر اور سنو رسول اللہ ﷺ اور اپنے درمیان کچھ کو ماننا پڑے گا، کہتے ہیں کون؟ میں نے کہا صحابۂ کرام۔ کہنے لگے واقعی، پھر فوراً اس پر وہ دوسری بات کھل گئی کہ واقعی صحابۂ کرام کے بغیر تو ہم رسول ﷺ کو سمجھ نہیں سکتے، ہم نے آپ ﷺ کو تو نہیں دیکھا، جنہوں نے دیکھا ہے انہی کے ذریعے سے ہم لے سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ اتنا بڑا علم تھا جو اللہ پاک اس وقت دے رہا تھا کہ اللہ کرے کہ اس پر شکر کی توفیق نصیب ہو جائے، کیوں کہ اللہ کی ذات وراء الوراء ہے، وہ قادر و قدیر ہے، جس کے ساتھ یہ بات سمجھ میں نہیں

آتی کہ درمیان میں کوئی اور ہونا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو عملاً ظاہر کر دیا کہ ہونا چاہیے، بہت بڑا jump cover ہو گیا۔ اب آپ ﷺ اور ہمارے درمیان تو یہ ساری باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں کیونکہ ہم نے آپ ﷺ کو دیکھا نہیں ہے، جنہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے انہی کے ذریعے سے ہی ہم آپ ﷺ کو جان سکتے ہیں، لہذا صحابہ کا ہونا لازم ٹھہرا ورنہ ہم آپ ﷺ کو جان ہی نہیں سکیں گے۔ نیز میں نے کہا صحابہ کو سمجھنے کے لئے بھی کچھ لوگ ہمیں درمیان میں ماننے پڑیں گے، کہتے ہیں وہ کون؟ میں نے کہا فقہاء۔ یہ بات بھی ان کو فوراً سمجھ میں آ گئی، کہنے لگے ہاں بالکل۔ کیوں کہ صحابہ کی باتوں کا عملاً نچوڑ نکالنا اور ان کو عملی مسائل میں ڈھالنا فقہا کا کام ہے، جن بد بختوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ فقیہ کا کردار ہے حدیث سے سنت تک لانا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت۔ میری حدیث نہیں فرمایا۔ یہ غلط فہمی ہے۔ سنت مطلوب ہے حدیث اس کا ذریعہ ہے۔ ہزاروں حدیثوں میں آپ کو ایک سنت مل سکتی ہے، ہزاروں حدیثوں سے ایک سنت کی تشریح ہوتی ہے، اگر وہ سنت آپ کو مل گئی تو آپ کو حدیث شریف کا نچوڑ مل گیا۔ اب یہ کام کون کرے گا؟ فقہا کریں گے۔ کہنے لگے ہاں بالکل صحیح بات ہے۔ میں نے کہا فقہا کے ذریعے سے حاصل شدہ علم کو عمل میں لانے کے لئے کچھ اوروں کی ضرورت ہے، کہتے ہیں کون؟ میں نے کہا صوفیا۔ وہ چونکہ کتابیں پڑھ چکے تھے فوراً کہنے لگے بالکل ٹھیک ہے۔ اب اس کو ساری کتابوں کا نچوڑ مل گیا، لیکن درمیان میں کچھ باتیں مزید کرنے کے بعد۔ حالانکہ یہ چیزیں انہی کتابوں کے اندر موجود تھیں، میرے پاس اوپر سے کوئی وحی یا الہام نہیں آیا تھا کہ میں نے اس کے ذریعے سے بات کی ہو۔ بلکہ یہ ساری کتابوں کے اندر موجود ہیں لیکن مستحضر کرنا اللہ جل شانہ کا کام ہے کہ کس علم کو کس وقت مستحضر کرایا جائے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت وہ فضل ہو گیا، نتیجتاً اس کو بھی وہ بات سمجھ میں آ گئی۔ پھر میں نے کہا کہ ہمارے لئے ان تمام صوفیا کا نچوڑ شیخ ہے، کہنے لگے ٹھیک ہے۔ اس وقت بس "ٹھیک ہے" تک بات رہ گئی۔ لیکن الحمد للہ چند دنوں کے بعد وہ تشریف لائے، بیعت ہوئے اور الحمد للہ ذکر و اذکار کر رہے ہیں، کبھی کبھی تشریف لاتے ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بات

سمجھ میں آنا واقعتاً مشکل ہے۔ اس طرح کے لاکھوں لوگ ہیں جن کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی اور اس چیز کے علم کے باوجود سمجھ نہیں آتی یعنی اس چیز کو جانتے ہوئے بھی انہیں ان چیزوں کا علم نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ان تمام چیزوں سے مستغنی قرار دیتے ہیں حالانکہ مستغنی کیسے ہو سکتے ہیں، خود ہی پڑھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں سب کے ساتھ کیسے ہوئیں، میں کیسے اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دے سکتا ہوں، مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے تو یہ طریقہ اختیار کیا گیا ان کو براہِ راست نہیں دیا گیا، ان کو کسی مرشد کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور میں کہوں کہ مجھے براہِ راست ملے گا۔ یہی بنیادی بات ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

متن:

اسی طرح جو شخص بھی اللہ جل جلالہ کی رضا جوئی کو تلاش کرے، تو جب تک کسی رہ شناس اور منزل آگاہ شخص کا دامن نہ پکڑے اپنی منزل مقصود کو نہیں پہنچے گا۔ سلوک کی چند حکایتوں کے ذریعے جو کہ جواں مردوں کی حکایتیں ہوتی ہیں۔

تشریح:

یہاں بھی وہی بہت عجیب بات ہو رہی ہے۔

جواں مردوں کی حکایتیں ہوتی ہیں یعنی جنہوں نے اس میں سے اپنی زندگی گزاری ہوتی ہے استقامت ظاہر کی ہوتی ہے پورا عرصہ استقامت کے ساتھ اس پہ چلے ہوتے ہیں۔

متن:

نامردوں کی زبان سے ادا کئے جائیں۔

تشریح:

یعنی جو اس کے لئے ایک لمحہ بھی نہیں دے سکتے وہ نامرد ہیں۔ اور جو پوری زندگی اس پر پابند رہیں استقامت اختیار کریں وہ مرد ہیں۔

متن:

کام کب اور کیسے درست ہو گا۔ اس راستے میں ہدایت کے لئے مرد کامل چاہیے، تاکہ انسان کو مراد تک پہنچائے چند رکعتوں اور چند حکایتوں سے کیا چیز درست ہو گی۔

تشریح:

صحیح بات ہے پورا آپریشن ہے، یہی وہ چیز ہے جو ہمارے بزرگ فرماتے ہیں، کبھی پنجابی زبان میں فرماتے ہیں، کبھی پشتو زبان میں فرماتے ہیں، رحمٰن بابا پشتو میں کہتے ہیں اور بلھے شاہ اور سلطان باہو اور کئی حضرات پنجابی میں فرماتے ہیں، باتیں تو ایک ہی ہیں، لیکن چونکہ درمیان میں ربط نہیں جانتے ہیں لہٰذا پڑھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ اب کیا یہاں رکعتوں کی مخالفت ہے؟ رکعتوں کی مخالفت نہیں ہے اگر کوئی جانتا نہ ہو تو وہ رکعتوں کی مخالفت شروع کر دے گا، یہ نماز پڑھ رہا ہے، کیسے پڑھ رہا ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ ان حضرات نے یہ بات کی ہی نہیں ہے، نہ بابا بلھے شاہ نے یہ بات کی ہے نہ ہی سلطان باہو رحمۃ اللہ نے کی ہے اور نہ رحمٰن بابا نے کی ہے، کسی بزرگ نے بھی شریعت کے اعمال کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن شریعت کے ظاہر کو کافی سمجھنے کی مخالفت ضرور کی ہے کہ اس کو کافی نہ سمجھو، ظاہر چھلکا ہے اور اس کے اندر جو حقیقت ہے وہ گری ہے، اس لئے جب تک آپ کو کسی عمل کی حقیقت حاصل نہ ہو، آپ صرف اس کے ظاہر پر کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔

متن:

پس اے میرے محبوب جیسا اللہ تعالیٰ کی عنایت ازلی کسی مرید کے بارے میں نصیب ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ اس مرید کو ایک ایسے پیر کی محبت نصیب فرماتا ہے کہ اُس پیر کا ظاہر علوم شریعت سے آراستہ ہوتا ہے، اور اس کا باطن کمال معرفت اور حقیقت سے مزین ہوتا ہے۔

تشریح:

اللہ کا ساتھ، اللہ کا فضل، اللہ کا کرم ہوتا ہے۔ الحمد للہ میں اکثر انتہائی محبت اور شوق کے ساتھ کہا کرتا ہوں کہ ہم نے پشاور یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا، کسی مدرسے میں داخلہ نہیں لیا تھا، کسی خانقاہ میں داخلہ نہیں لیا تھا، ایک دنیاوی چیز کے لئے گئے تھے، یہ ہم مانتے ہیں یہ ہم چھپا تو نہیں سکتے، بات بھی یہی تھی۔ تاہم اللہ کا فضل ہوا کہ ہمیں اللہ والوں کے ساتھ بٹھا دیا، یہ اس کا کرم ہے اگر وہ کرم نہ کرتا تو ہم کیا کرتے۔ حضرت

تسنیم الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے خاندان کے بزرگ گزرے ہیں ایک دفعہ میں نے انہیں بڑے شوق اور محبت کے ساتھ کہا کہ حضرت میں بڑا خوش قسمت ہوں، فرمایا کیسے؟ میں نے کہا الحمد للہ یونیورسٹی گیا تو مولانا صاحب مل گئے، خاندان میں آپ تک رسائی ہوئی، فلاں جگہ گیا تو فلاں سے ملاقات ہو گئی، فلاں جگہ گیا تو فلاں سے ہو گئی۔ حضرت نے فرمایا ہاں واقعی تم خوش قسمت یقیناً ہو، لیکن سب کے لئے یہ مواقع موجود ہیں، اللہ پاک نے ہر جگہ لوگوں کو بٹھایا ہے، ہاں جس پر اللہ کا فضل ہو جائے ان تک پہنچا دیتا ہے، بات تو بالکل صحیح ہے، ہوتے تو ہیں، یہ الگ بات ہے کہ پشاور یونیورسٹی میں مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے، لیکن بعض لوگوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ مولانا صاحب ادھر ہیں۔ ہمارے سامنے کی بات ہے، یہ خط میرے پاس آیا تھا محمد زمان گاؤں علی روحان ڈاکخانہ سخا کوٹ ضلع مالاکنڈ، یہ صاحب انجینئرنگ میں مجھ سے ایک سال جونیئر تھے، ایک ہی کالج میں ہم پڑھے تھے۔ کسی اور کے ذریعے سے ہماری اعتکاف کی مجلس میں آئے، امام دین خان صاحب جو ہمارے ہاں آتے ہیں ان کے ذریعے سے آئے، ہمارے ساتھ اعتکاف میں تھے، 10 راتیں 10 دن ہمارے ساتھ گزارے، اب میری مولانا صاحب کے بارے باتیں ہو رہی ہیں، مولانا صاحب کو تو وہ بھی جانتے تھے، مجھے کہتے ہیں اف! میں مولانا صاحب کے گھر کے سامنے سے روزانہ گزرتا تھا، میرا راستہ ہی وہی تھا، مجھے تو یہ باتیں نہیں معلوم جو آپ سے سن رہا ہوں۔ کاش مجھے پہلے معلوم ہوتیں تو میں بھی حضرت کی مجلس میں شامل ہوتا، یہ باتیں مجھے پہلے کیوں معلوم نہیں تھیں۔ حالانکہ یہ صاحب مجھ سے ایک سال جونیئر ہیں۔ جب کہ ہم جماعت تھے اور ہم جماعت کے ساتھ ساتھ جو ہوتے ہیں ان کے ساتھ بڑی بے تکلفی ہوتی ہے لہٰذا وہ کسی کی نہیں مانتے۔ لیکن چونکہ طلب تھی اس لئے اللہ نے ان پر بڑا فضل فرمایا، معمولات کے بڑے پکے ہیں اور اپنے معمولات کا پورا ایک postmortem کر کے معمولات کا chart مجھے ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے ہیں اور لوگ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ پتا نہیں ان کو کیا ہو گیا کہ اس طرح لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے مولانا صاحب کو ایسے نہیں دیکھا جیسا دیکھنے کا حق ہے، صرف مولانا صاحب کو دیکھنے والوں کو دیکھا ہے، اگر مولانا صاحب کو دیکھتے تو پھر کیا ہوتے؟ کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ اصل میں یہی بنیادی چیز ہوتی ہے، ہم لوگ اس کو نہیں جانتے، ہم سمجھتے

ہیں ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔ اور جب ہم مولانا صاحب کی مجلس میں جاتے تو بعض لوگ اس وقت شاید سوچتے کہ یہ روزانہ ادھر کیوں جاتے ہیں، عصر سے لے کر مغرب تک ادھر بیٹھے رہتے ہیں، حالانکہ یہ وقت تو کھیلنے کا ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت لوگ کھیلتے ہیں، کوئی volleyball کھیلتا ہے، کوئی basket ball کھیلتا ہے، کوئی کیا کھیلتا ہے، کوئی کیا کھیلتا ہے، یہی وقت ہوتا ہے طالب علموں کے کھیلنے کا۔ لیکن ہم اس وقت حضرت کے پاس ہوتے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ چیزیں واقعتاً اللہ کی طرف سے ہی ملتی ہیں، جن پر اللہ کا فضل ہوتا ہے ان کو ملتی ہیں۔

متن:

اور غرور و تکبر کی آنکھیں اس نے باہر نکال پھینک دی ہوتی ہیں، (یہ مشائخ کے بارے میں فرمارہے ہیں) حرص اور لالچ کے دامن کو قناعت کے پتھروں سے بھروایا ہوتا ہے۔ اس پیر کا ظاہر شریعت کے سیدھے راستے پر قائم ہوتا ہے۔ اور اس کا باطن ریاضت کی بھٹی میں کندن بن چکا ہوتا ہے۔ اور اُس سے ہر گھڑی مرید کے دل کی کھیتی میں لطائف کا تخم کاشت کرتا ہے۔ اور ہر دن وہ تخم حقائق کے آداب کے دقائق سے سیراب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نیک توجہ اور نصیحت کے قبول کرنے اور اللہ کریم کی عنایت سے مرید کے مقبول اعمال صالحہ اور پسندیدہ کردار شریف احوال اور مسنون مقامات میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے۔

تشریح:

یہ باتیں ہر ایک نہیں لکھ سکتا، یہ نچوڑ ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جیسے انسان کسی چیز کو دیکھ رہا ہو اور دیکھ دیکھ کر لکھ رہا ہو۔

متن:

اور غیبی واردات کی خوشبو کے جھونکے مرید کے دل کے باغ میں محسوس ہوتے ہیں۔ اور اس مرید مقبول کا باطن صفا و طہارت کے انوار اور وفا و محبت کے اسرار سے منور ہو جاتا ہے۔ پس اے میرے پیارے، یہ تمام مذکورہ نشانیاں مقبول مرید کی ہیں۔ بصورت دیگر بے بہرہ اور بد نصیب مرید کی نشانی یہ ہے کہ کسی جاہل شیخ کے پاس جا کر اُس جاہل

جس کا دل تاریک ہو اور جس کی خصلت سر تا پا حیوانی ہو اور اُس کے بارے میں یہ کلام ربانی پورے طور پر منطبق ہو۔ ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ (المطففین:15)
ترجمہ:۔ بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے۔
اگرچہ یہ آیت شریف کافروں کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ مگر جب تم طریقت میں جاؤ تو لاکھوں کفر سامنے پیش آئیں گے۔

تشریح:

ایک ہوتا ہے کفرِ شریعت اور ایک ہوتا ہے کفرِ طریقت۔ یہ بات بھی ذرا سمجھنی چاہیے کفر شریعت میں انسان کافر ہو جاتا ہے، اس پر کفر کا اطلاق ہوتا ہے اور اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اس کی نمازیں ضائع ہو جاتی ہیں اور پھر اگر دوبارہ ایمان نصیب نہ ہو تو ہمیشہ کے لئے خسارے میں چلا جاتا ہے، یہ کفرِ شریعت ہے۔ کفرِ طریقت یہ ہے کہ جو چیزیں حاصل ہونا چاہیے تھیں وہ حاصل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک شعر ہے:

کافرِ عشقم، مُسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ، حاجتِ زنّار نیست

"میں عشق کا کافر ہوں، مجھے مسلمانی درکار نہیں، میری ہر رگ تار تار ہوچکی ہے، مجھے (کافروں کی طرح) زُنار کی حاجت بھی نہیں ہے"

چونکہ لوگ پھر نہیں سمجھ پاتے، در اصل وہ یہی بات ہوتی ہے۔ چنانچہ کفرِ طریقت یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے مشائخ سے جو چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے ان کے حاصل کرنے سے رہ جاتا ہے، یہ کفرِ شریعت نہیں ہے یعنی اس پر شرعاً کافر کا level نہیں لگایا جا سکتا، لیکن محرومی اس کو ہو جاتی ہے، جو چیزیں حاصل کرنی تھیں ان سے وہ رہ جاتا ہے۔

متن:

اس کے بعد ہر روز وہ گمراہ شیخ نام نہاد تقلید کی تاریکیوں اور رسمی عبادتوں کے بندھن اُس مرد کے گرد سخت کرتا جاتا ہے۔ اور باطل تصورات اور فاسد خرافات سے اس بے چارے پر حق کا راستہ بند کرتا ہے۔

تشریح:

آج کل ایسا ہی ہے، یعنی گانٹھیں لگاتے رہتے ہیں کہ اس طرف بھی نہ دیکھو، یہ بھی نہ دیکھو، یہ بھی نہ ہو، یہ بھی نہ ہو۔ اور تمام راستے اپنی طرف کھول کے رکھتا ہے اور باقیوں کے لئے بند کرتا رہتا ہے۔

متن:

اور گمراہی اور بدعتوں کے کانٹے اس بے چارے مرید کے راستے میں بچھاتا رہتا ہے اور ہر گھڑی کمینگی اور ضیانت کے بیج اس کے دل میں کاشت کرتا ہے اور اس کا باطن حرص اور حسد کی غلاظت سے گندہ اور پلید کرتا ہے۔ اے میرے محبوب، "لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ" یعنی شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

تشریح:

یعنی سننے والا ہے دیکھنے والے کے برابر کہاں ہو سکتا ہے؟

متن:

اس لئے زمانے کے پیروں اور مریدوں کے حال پر نظر کرنی چاہیے کہ ابلیس کے دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور اس کے باوجود فقر کا نام اپنے ساتھ لگایا ہے۔

تشریح:

اپنے آپ کو فقیر کہتے ہیں لیکن فقر سے بہت دور ہوتے ہیں، ان کی نس نس میں دنیا پرستی ہوتی ہے لیکن اپنے نام کے ساتھ فقیر کا لفظ لگایا ہوتا ہے۔

متن:

اور متقیوں اور اولیاء اللہ کا لباس پہن رکھا ہے۔ اور اس لباس میں مقبولان درگاہ ایزدی کے شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو اہل یقین کی شکل و صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا شعار رندی اور کھیل کود اور ان کے مجلس کے آداب بدعت اور بے نمازی اور ان کے وجد و حال رفض اور خواہشات کی تکمیل "سِمَاعٌ حَرَامٌ لِلْعَوَامِ لِبَقَاءِ فُتُوْرِھِمْ" عوام کے لئے اس کی سستی کی وجہ سے حرام ہے۔ ان کی مجلس جھگڑا فساد ان

کے اسرار و خلوت تفرقہ اور خباثت اور حرام کی کمائی پر فخر کرنا، اور اسی طرح ان کا افتخار اور سبقت قباحت اور بے حیائی کے امور میں ہوتا ہے۔

تشریح:

جاہل پیروں کا کیا کمال کا نقشہ کھینچا ہے۔

متن:

عام جاہل لوگ جو کہ جانوروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں، ان مردود لوگوں کو جو کہ نفس کے تقاضوں اور خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اباحت اور کفر کا نام طریقہ رکھا ہے۔ اور اسی کو طریقہ کہتے ہیں۔ یہ سب دین اسلام کی حقیقتوں سے بے گانہ ہیں۔ اور ان کے مرید ان گمراہوں کے ساتھ ضلالت اور گمراہی کے صحرا کے اس سفر میں سرگشتہ اور گمراہ ہو گئے ہیں۔ پس اے میرے پیارے یہ بات گرہ میں باندھ کے رکھ لے کہ جب تک دل کا آئینہ بشری صفتوں کی برائیوں سے پاک نہ ہو، ایمان اور اسلام کی روشنی اور انوار دل میں کبھی نہیں آ سکتے، اور جس کسی کے اعمال و کردار میں اخلاص نہ ہو، اور ہمیشہ خواہشات نفسانی کا تابع اور فرمانبردار ہو وہ کبھی بہبود و نجات کی شکل بھی نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ ان سب کا آئینہ دل کو بشری اوصاف کی کدورتوں سے صاف رکھنا اور اعمال و کردار کو ہر اخلاص بنانے کا میوہ اور حاصل اسلام ہے اور اسلام کی حقیقت حکم ماننا ہے۔ اور نفس کی مخالفت کرنا بھی احکام میں سے ایک حکم ہے۔ "اَوْحَی اللّٰہُ تَعَالٰی اِلٰی مُوْسٰی فَقَالَ یَا مُوْسٰی اِنْ اَرَدْتَّ رَضَائِیْ فَخَالِفْ نَفْسَكَ اِنِّیْ لَمْ اَخْلُقْ خَلْقًا یُنَازِعُنِیْ غَیْرَہ" "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی حکم فرمایا کہ اے موسیٰ اگر تم کو میری رضا جوئی مطلوب ہو تو اپنے نفس کی مخالفت کر کیونکہ میں نے اس کے سوا کوئی دوسری مخلوق ایسی نہیں بنائی جو میرے ساتھ نزاع کرے"۔ پس نفس کا حکم ماننا تمام معصیتوں اور گناہوں کی جڑ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ خیبر کے جہاد سے واپس تشریف لائے "فَقَالَ یَا اَصْحَابِیْ غَزَوْنَا الْجِهَادَ الْاَصْغَرَ وَبَقِیَ الْجِهَادَ الْاَکْبَرَ وَهِیَ جِهَادُ النَّفْسِ جَاهِدُوا النَّفْسَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ" "آپ ﷺ نے فرمایا، کہ اے میرے اصحاب کرام ہم نے چھوٹا جہاد تو کر لیا، اور بڑا جہاد باقی رہ گیا ہے،

اور وہ نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ پس تم اس نفس کے ساتھ جہاد کرو جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے"۔ اے میرے پیارے، عارف وہ ہے جو اغیار (غیر اللہ) کی ہستی کا نقش اپنے وجود کی تختی سے مٹا کر دھو لے۔

تشریح:

یہاں بھی ذرا بحث کی ضرورت ہے، جہاد اکبر اور جہاد اصغر کے بارے میں بھی بڑی باتیں ہوتی ہیں جہاد اکبر اور جہاد اصغر سے مراد لینا کہ جو خانقاہ میں بیٹھا ہے وہ میدان میں لڑنے والے مجاہد سے اچھا ہے، یہ غلط ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر حالت میں، ہر وقت کسی کام کو اللہ کے لئے کرنے اور اپنے نفس کے لئے کرنے میں جو نزاع ہو اس میں اپنے آپ کو حق پر قائم رکھنا جہاد اکبر ہے۔ یعنی صرف ایک وقت نہیں بلکہ ہر ہر وقت، ہر ہر لمحے وہ دیکھتا ہے کہ میں نفس کی مان رہا ہوں یا میں اللہ کی مان رہا ہوں، میں اللہ کا بندہ ہوں یا نفس کا بندہ ہوں۔ قرآن پاک میں اس بارے میں ہے: ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ (النازعات:40) چنانچہ ہر ہر لمحے اس کا خیال کرنا کہ انسان اپنے نفس کی ماننے سے بچ جائے اور اللہ کی بندگی میں آ جائے یہ جہادِ اکبر ہے اور کافروں کے ساتھ جو جہاد ہے اس میں بھی یہ جہاد ہے اور بہت بڑے پیمانے پر ہے کیونکہ اس وقت تو اور زیادہ مشکل ہوتی ہے لیکن جو جہاد اس چیز سے خالی ہو وہ جہاد ہی نہیں رہتا وہ تو جدال رہ جاتا ہے، وہ صرف ایک قصاص بن جاتا ہے۔ اور یہ چیز چونکہ ہمیشگی کے لئے ہے اس لئے اس کو جہادِ اکبر کہا گیا، یہ مطلب نہیں کہ وہ جہاد اکبر نہیں ہے، وہ چونکہ تھوڑے عرصے کے لئے ہے اس لئے اس کو جہادِ اصغر کہا گیا ہے کہ تھوڑے عرصے میں اپنے اوپر قابو پانا آسان ہے بمقابلہ زیادہ عرصہ کے لئے قابو پانے کے۔ کیونکہ جو انسان جہاد کر رہا ہوتا ہے تو عمر کا سارا حصہ تو اس طرح نہیں ہوتا۔ جیسے صرف ایک رات کو دو گھنٹے مسلسل عبادت میں کھڑے ہونا مشکل نہیں ہے، لیکن اگر ہر روز 2، 2 گھنٹے کے لئے کھڑے ہو جائیں تو مشکل ہو گا۔ بلکہ دو گھنٹے تو کیا صرف آدھا گھنٹہ ہر روز کے لئے کھڑا ہونا مشکل کام ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں اگر میں 30 کلو وزن 10 منٹ کے لئے اٹھاؤں تو یہ مشکل نہیں ہے لیکن اگر میں 5 کلو وزن 15 میل تک لے جاؤں تو یہ مشکل ہے۔

چنانچہ جہادِ اکبر اور جہادِ اصغر کی بھی یہی مثال ہے کہ جہادِ اکبر یہ ہے کہ تسلسل کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ جل شانہ کا بنائے رکھنا اور نفس کا نہ بننے دینا۔

متن:

بیت

ہر کہ ایں سعادت رو نمود
ابواب مواہب غیبی برو کشود

جس کسی کو یہ سعادت ہاتھ آئی تو غیب کے فیوضات و مواہب کے دروازے اُس پر کھل گئے اور خوف و اُمید اور ترقی و تنزل اور دنیا و آخرت کی فکر و خیال سے نجات حاصل کر گیا۔ اے میرے پیارے، کافر تو آپ کو جان سے مارنے کا ارادہ کرتے ہیں، اور یہ مکار نفس آپ کے ایمان کو ختم کرنے کے درپے ہے،

تشریح:

یہ بہت بڑا نکتہ ہے کہ کافر تو آپ کو جان سے مار دے گا، اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے، لیکن نفس آپ کے ایمان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

متن:

یعنی یہ ایسا دشمن ہے کہ تمام زخم اپنے دوست اور ساتھی پر لگاتا ہے اور ایسا کافر ہے جو اپنا گھوڑا دوست اور محبت کرنے والے پر دوڑا کر اسے روندتا ہے۔ جو کوئی نفس کی دوستی میں جس قدر کوشش کرتا ہے، تو ابدی ہلاکت کا زہر اُس قدر نوش کرتا ہے، جو کوئی نفس کے عشوہ و ناز پر جتنا فریفتہ ہوا اپنے دین و ایمان کی عزت اُس قدر گنوائی۔

تشریح:

میرے خیال میں یہاں تک کافی ہے کیونکہ اس کے بعد نماز کا وقت ہو جائے گا اور ان شاء اللہ العزیز ذکر بھی کرنا ہے، اللہ جل شانہ ہم سب کو بزرگوں کے فیوض و برکات نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔